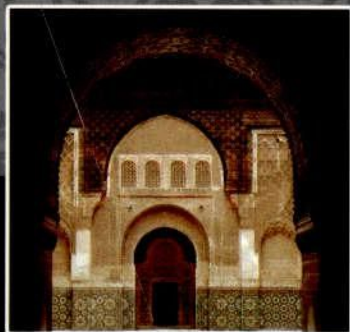
نظرثانی شدہ ایڈیشن

رہنمائے خطابت



تألیف

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

السعید
کراچی ۔ پاکستان 0313-9264214

خطابت کے اصول وآداب، خطابت سیکھنے کے طریقے

تصحیح واضافہ شدہ ایڈیشن

رہنمائے خطابت

درسِ قرآن، درسِ حدیث اور لیکچر کی تیاری، منتخب تقریریں

مفتی ابولبابہ شاہ منصور



0321-2050003, 0313-9266138

کتاب	رہنمائے خطابت
مصنف	مفتی ابولبابہ شاہ منصور
طبع اوّل	محرم 1428ھ - 2007ء
طبع دوم	ربیع الثانی 1429ھ - 2008ء
طبع سوم	شوال 1430ھ - ستمبر 2009ء
باہتمام	سید محمد انظر شاہ
ناشر	السعید

ملنے کے پتے

پاکستان کے تمام مشہور کتب خانوں سے دستیاب ہے

رابطہ: 0313-9264214



0321-2050003, 0313-9266138

فہرست

عنوان | صفحہ

عنوان	صفحہ

خطابت کی اقسام

تقریر کی تیاری کے پانچ مراحل

عنوان | صفحہ

خطیب کے لیے چند ناگزیر چیزیں

تقریر کے لوازم

تقریر کی خوبیاں

عنوان | صفحہ

تقریر کی خامیاں

عنوان صفحہ

کامیاب تقریر کی چار صفات

تقریر کے اُصول

تقریر کو مؤثر کیسے بنایا جاتا ہے؟

تقریر سیکھنے والے کے لیے گیارہ نصیحتیں

عنوان | صفحہ

درسِ قرآن کی تیاری

عنوان	صفحہ

عنوان | صفحہ

عنوان | صفحہ

موضوعاتی درسِ قرآن کی تیاری

پہلا مرحلہ

دوسرا مرحلہ

تیسرا مرحلہ

چوتھا مرحلہ

پانچواں مرحلہ

چھٹا مرحلہ

عنوان | صفحہ

ساتواں مرحلہ

آٹھواں مرحلہ

آخری مرحلہ

اطاعت کے موضوع پر درس کا نمونہ

عنوان | صفحہ

درسِ حدیث

لیکچر کی تیاری

چند نمونے

تیسری طباعت کا مقدمہ

آرزو کا اظہار

تحریر و تقریر دعوت کے دو ذرائع ہیں۔ علمائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے چونکہ داعی بنا کر داعیوں کا وارث بنا کر مبعوث کیا ہے، اس لیے ان دونوں فطری ذرائع اظہار میں مہارت کا حصول ان کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کا لازمی تقاضا ہے۔ ویسے بھی مشاہدہ ہے کہ طالب جان فطری طور پر ادیب اور خطیب ہوتے ہیں۔ ان کی فطری اور وہبی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے اگر انہیں تربیتی عمل سے گزار دیا جائے تو یہ دعوتِ دین کے مختلف میدانوں میں اپنے کارہائے منصبی بطریق احسن انجام دے سکتے ہیں۔ ان مہارتوں کی تربیت کی ابتدا طالب علمی کے آغاز سے ہو جانی چاہیے اور ایک پختہ کار داعی اور لکھاری بننے تک اسے جاری رہنا چاہیے تاکہ مدارس کی فضا میں یہ دو چیزیں اور ان کے اصول و آداب اتنی اچھی طرح رچ بس جائیں کہ جو بھی طالب علم دینی مدارس کے گہوارے میں وقت گزارے وہ دعوت کے ان دو بنیادی اور لازمی رویّوں سے بھرپور طور پر مانوس اور واقف ہو۔

''تحریر کیسے سیکھیں؟'' اور ''رہنمائے خطابت'' نامی دو کتابیں اسی آرزو کا اظہار ہیں۔ ان کی مزید بہتری کے لیے ان پر نظر ثانی اور تصحیح و اضافات کا کام جاری رہتا ہے۔ ''رہنمائے خطابت'' کے جس ایڈیشن کا لمس آپ اپنے ہاتھوں سے محسوس کر رہے ہیں یہ عرق ریزی کے ساتھ نظر ثانی اور تصحیح و اضافات سے گذرا ہے۔ اس میں اصل تو ہماری مشرقی میراث (التراث الإسلامی) ہے لیکن اس کے ساتھ مغرب کے اہلِ فن کے تجربات سے

بھی "الحکمۃ ضالۃ المؤمن" کے تحت استفادہ سے عار محسوس نہیں کیا گیا۔ کتاب کی ترتیبِ نو پر اچھا خاصا کام ہوا ہے جس سے اس کا حلیہ آپ بدلا ہوا اور ان شاء اللہ نکھرا ہوا محسوس کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ طلبہ کو خطابت کے اصول و آداب سے روشناس کروانے اور انہیں اس میدان کا پختہ کار شہسوار بنانے میں یہ حقیر کاوش کام آ جائے اور ہمارے طلبہ جب عملی زندگی کا آغاز کریں تو انہیں اپنا فرض پورا کرنے میں کسی قسم کی جھجھک ہو، نہ وہ عدم تربیت سے پیدا ہونے والے بناوٹی خوف کا شکار ہوں، بلکہ اللہ پر کامل یقین اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ وہ ان درپیش چیلنجز کا سامنا کر سکیں جن سے بہر حال ہماری طالب برادری کے کسی فرد کو فرار کی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ منصور

عشرۂ اولیٰ رمضان: ۳۰ھ

پہلی طباعت کا مقدمہ

اضطراری تالیف کی وجوہات

خطابت سے اس عاجز کا تعلق بس اتنا ہی ہے جتنا صحرا کا پانی سے۔ لیکن اس طرف کیسے آ نکلا؟ اور یہ کتاب کیسے وجود میں آ گئی؟ یہ داستان کسی قدر دلچسپ ہے۔

پہلی وجہ تو اس کی یہ ہوئی کہ ماضی قریب میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے نام نہاد مقرر، مدرس، محققین اور محققات کی کھیپ خودرو پودوں کی طرح جا بجا اُگ کر ماڈرن اسلام کی تبلیغ زور و شور سے کر رہی ہے۔ اس نسل کا نہ کوئی نام ہے نہ نسب، علمیت نہ روحانیت، دردِ دل نہ فکر امت بس نیم خواندہ جاہلیت ہے اور مذموم خفیہ مقاصد کے حصول کے لیے مسابقت۔ کوئی مین ہٹن سے آیا ہے اور کوئی گلاسکو سے، لیکن یہ اچانک ہی بہت زیادہ مقبول ہو گئے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ کون سا جدید ذریعہ ابلاغ نہیں جہاں ان کا غلغلہ نہیں۔ اور صورتحال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر ان موسمی بیٹروں اور ایمان خور سنڈیوں کا سدّباب نہ کیا گیا تو مستقبل قریب میں نئی نسل کے دین و ایمان کے محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی موت آپ مر گئے ہیں کہ جو لوگ ان کٹھ پتلیوں کا دھاگا ہلاتے تھے انہیں اب ان کی ضرورت نہیں رہی البتہ کچھ باقی ہیں اور بڑے زور و شور سے باقی یا باقیات ہیں۔

بندہ نے جب ان کی دن دگنی رات چوگنی ترقی دیکھی تو یہ سوچ کر دل کو تسلی دینے پر اکتفا دیانت کے خلاف سمجھا کہ یہ محض مادی وسائل کی بنا پر طبقہ اشرافیہ میں دین کے نام پر بے

دینی یا بددینی سکھا رہے ہیں...... نہیں بندہ نے صرف یہ سوچنے پر اکتفا نہیں کیا...... اور ان کی کامیابی میں مؤثر مادی وسائل کے علاوہ دیگر اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش شروع کی۔ گھنٹوں گھنٹوں ان کی کیسٹیں سنیں۔ دروس میں سماعت کی نیت سے شرکت کی۔ اور اپنی محدود فہم کے مطابق عصر حاضر میں ان کی دعوت کی مقبولیت کے کچھ اسباب تلاش کیے۔ یہ کتاب انہی اسباب کی تلاش کے دوران لکھی گئی اور ان اسباب کی نشاندہی کی خاطر وجود میں آئی۔ خلاصہ یہاں عرض کیے دیتا ہوں اور تفصیل کے لیے آپ کو کتاب کے مطالعے کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔

ان حضرات کی نیم مذہبی نیم لامذہبی گفتگو اس لیے غور سے سنی جاتی ہے کہ:

۱- ان کی زبان معیاری، شائستہ، عام فہم اور رائج الوقت اینگلو اردو اسلوب کے مطابق ہوتی ہے جبکہ میری اور میری برادری کے فضلائے کرام اور طلبہ کی اردو ثقیل، نامانوس الفاظ، پیچیدہ عربی و فارسی تراکیب سے مرصّع اور عربک یا پرشین اردو ہوتی ہے۔ جس سے عوام مانوس نہیں ہوتے۔ مثلاً دیکھیں ہمارے ہاں بے تکلف کہا جاتا ہے:

"یہ وہ طلبہ ہیں جن کی سارے سال تکبیر اولیٰ کے ساتھ جماعت کی نماز فوت نہیں ہوئی۔"

اب عام آدمی حیران ہوتا ہے کہ کیا نماز بھی فوت ہوتی ہے؟ اسی طرح ہم بلاتکلف کہتے ہیں:

"اس سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوتا۔"

جبکہ پاکستان میں ایم اے اسلامیات یا عربی کیے ہوئے ماسٹرز بھی لفظ " معتد بہ "کا معنی تو کیا جانیں شاید اس کا صحیح تلفظ بھی نہ کرسکیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے لیکن پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی جانشینوں کا اپنے معاشرے کی زبان اور محاورے سے اس قدر ناواقفیت کی سمجھ نہیں آتا کیا تاویل کی جائے؟

۲-زبان واسلوب کے بعد ان حضرات کو ان تین چیزوں پر عبور حاصل ہوتا ہے:

(۱) چہرے کے تاثرات

(۲) آواز کا اُتار چڑھاؤ

(۳) جسم کی حرکات وسکنات

لہٰذا وہ جو کچھ بول رہے ہوتے ہیں، ان کا چہرہ، ہاتھ اور آواز تینوں مل کر اسی میں تاثیر اور تفہیم ساتھ ساتھ پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔

نہ تو چہرہ بے جان اور تاثر سے عاری ہوتا ہے نہ زائد از ضرورت جذباتیت کا استعارہ۔

نہ اعضا کی زبان کسی وقت ان کا ساتھ چھوڑتی ہے نہ بے ہنگم حرکات سرزد ہوتی ہیں۔

نہ وہ منمنا رہے ہوتے ہیں نہ چیخم دھاڑ کرتے ہیں۔ صوتی تاثرات کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

یہ تینوں چیزیں حدیث شریف سے ثابت ہیں لیکن ہمارے ہاں ان کی باقاعدہ تربیت کا نظم نہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تھے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ آواز بلند ہو جاتی تھی۔ جوش سے ایسا معلوم ہوتا تھا آپ سخت غصے میں ہیں گویا کہ کسی لشکر کے حملے سے ڈرا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ وہ تم پر صبح کو حملہ آور ہوگا یا شام کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ملا کر فرماتے تھے: میں اور قیامت اس طرح (قریب قریب) مبعوث کیے گئے ہیں۔ (۱/۲۸۴،۲۸۵)

آپ اس حدیث کو غور سے سے پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ درج بالا تینوں چیزیں حدیث شریف میں کتنی وضاحت سے مذکور ہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ایک انگلی سے اشارہ کرتے اور فرماتے: "اللھم

اشھد.“ کبھی دوانگلیوں کوملا کرفرماتے:”أنـاو کـافـل الیتیـم فی الجنة هكذا.“ کبھی دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال کر مومن کی مومن سے نصرت وحمایت کو ”تشبیک“ کے ذریعے سمجھاتے۔غرض کہ احادیث میں غور کیا جائے تو خطابت کے لوازمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اور بیانات میں فطری انداز میں خوبصورتی سے سموئے ہوئے ملتے ہیں۔افسوس کہ اہل مغرب اوران کے پروردہ گان نے ان پر جدید سائنسی انداز میں تحقیق کر کے انہیں نکتہ عروج تک پہنچادیا ہے مگر ہمارے ہاں گودڑی کے چند لعل تو اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر آسمان خطابت پر چمکتے اور دعوت دین کا پرچم لہراتے دکھائی دیتے ہیں لیکن عام طلبہ کے لیے ان چیزوں کی تربیت کا فقدان ہے۔فطری صلاحیتوں کے بل بوتے پر،سو میں سے ایک تیار ہوتا ہے جبکہ تربیت کا اہتمام کیا جائے تو سو میں چالیس تک تو ممتاز کارکردگی کے حامل نکل ہی آتے ہیں۔یہ کتاب انہی چالیس فیصد کی نذر ہے۔

۳- آخری اور اہم ترین بات جو ہم میں اوران نیم خواندہ جاہلوں میں بنیادی فرق ہے یہ کہ ان کے پاس قرآن وحدیث کا ٹھیٹھ علم نہیں ہوتا لیکن وہ قرآن وحدیث کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کر کے زندہ جاوید شکل میں پیش کرتے ہیں۔سننے والوں کو محسوس ہوتا ہے قرآن کریم ان سے باتیں کرتا ہے اوران کے گردوپیش پر تبصرہ کرتا ہے۔اس سے لوگوں کی دلچسپی غیر معمولی طور پر بڑھتی ہے اور رجوع الی القرآن میں بے تحاشا اضافہ ہوتا ہے۔ہمارے ہاں شانِ نزول اور ربط پر زور دیا جاتا ہے۔جبکہ شان نزول صرف ان آیات میں بیان کرنا چاہیے جہاں آیت کو سمجھنا اس کے پس منظر کو سمجھنے پر موقوف ہو۔اس کے علاوہ تو جس طرح صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین ”نـزلـت فی کذا“ کہہ کرآیت کا جدید ترین مصداق سامعین کو بتاتے تھے اسی طرح ہمیں آج کی دنیا میں قرآن کی ہدایت وحکمت اور عبرت وموعظت کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ سامعین محسوس کریں یہ آیت ہمارے لیے آج ہی نازل ہوئی ہے۔شان نزول

سے درس کی ابتدا ہوتے ہی سامعین غیر شعوری طور پر سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ایک تاریخی کتاب ہے جو ماضی میں کسی وقت پیش آئے ہوئے کسی واقعہ کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ آج کے دور میں جبکہ ہمیں پوری دنیا کی طرف سے بے شمار چیلنجوں کا سامنا ہے، قرآن کو عالمگیر اور زندہ جاوید شکل میں پیش کیے بغیر چارہ نہیں اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے خارجی مطالعہ و مشاہدہ کو محنت کر کے بڑھائیں۔ نئی کتابوں سے باخبر ہوں۔ گرد و پیش کو سمجھیں اور جہاں تک تاویل گنجائش دیتی ہے قرآن کریم کو معاشرے کے رجحانات اور معاصر حالات پر منطبق کر کے دعوت و نصیحت اور عبرت و موعظت کا سامان کریں۔

٤- آخری بات یہ ہے کہ ہمیں فقہی مسائل اور شریعت کی روشنی میں لوگوں کے دینی سوالات کے جوابات کا بخوبی علم ہوتا ہے لیکن ہم درس یا وعظ کے بعد سوال جواب کی محفل منعقد نہیں کرتے جبکہ ان حضرات کے پاس محض سطحی مطالعہ ہوتا ہے، فقہ کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی ہوتی لیکن وہ مطالعہ اور طلاقت لسانی کے بل بوتے پر سوالات کا سامنا کرتے اور سامعین کو قائل کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تنقیدی نظر سے سنا جائے تو ان کے جوابات میں فقہی اعتبار سے غلطی کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن بہر حال سامعین کو اپنا ایسا گرویدہ بناتے ہیں کہ لوگ دور دور سے ان کا درس سننے جاتے ہیں اور سر دھنتے واپس آتے ہیں۔ ہمارے علمائے کرام کو دینی مطالعہ کے ساتھ ساتھ خارجی حالات سے تازہ ترین واقفیت ہونی چاہیے تاکہ اعتماد کے ساتھ سوالات کا سامنا کریں اور دلجمعی کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی تسلی و تشفی کر سکیں۔ درس کی مقبولیت کا اہم سبب ہونے کے علاوہ یہ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کے شکوک و شبہات دور کریں اور مسائل و اشکالات کے حل کا فرض نبھائیں۔ اگر وہ یہ ذمہ داری پوری نہ کریں گے تو عامۃ الناس مسیحا کی تلاش میں پروفیسروں، اسکالروں کے پاس دوا لینے جائیں گے اور درد دِلا دوا لے کر واپس ہوں گے۔

یہ تو پہلی وجہ تھی اس کتاب کی اضطراری تالیف کی، دوسری بات یہ ہوئی کہ جب جامعۃ الرشید میں "تدریب الدعاۃ والمعلمین" کے نام سے کورس کا آغاز ہوا تو تدریب المعلمین کا موادتو بہتیرا مل جاتا ہے، "تدریب الدعوۃ" کے عنوان سے بھی عربستان میں تو خوب کام ہوا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ موضوع تا حال اہل دل کی توجہ کا منتظر ہے۔ اس کورس کے شرکا کو تقریر وخطابت اور وعظ و بیان کی تربیت دینے کا مرحلہ آیا تو ہماری کیفیت ان خان صاحب سے کچھ مختلف نہ تھی جو مُلّا صاحب کا بیان سن کر جوش میں آئے اور ایک ہندو کو دھوبی پٹکا مار کر سینے پر چڑھ بیٹھے کہ " کاپر کا بچہ: کلمہ پڑھو"۔ ہندو نے جب انہی سے کلمہ پڑھوانے کی درخواست کی تو انہیں یاد آیا کہ کلمہ شریف تو خود انہیں بھی درست طریقے سے پڑھتا نہیں آتا تو وہ دوسرے کو کیا مسلمان کریں گے؟؟؟

ہم نے جب کورس کے شرکا کو توجہ دلائی کہ گفتگو کا فن اور خطابت کے اسرار و رموز سیکھے بغیر ہم معاشرے میں اُگی ان زہریلی کھمبیوں کا توڑ نہیں کر سکتے تو ان میں جذبہ پیدا ہوا کہ وہ درسِ قرآن وحدیث کا طرز اور کسی سیمینار یا کانفرنس میں گفتگو کا طریقہ سیکھیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اس جیسی کتاب کی ضرورت ہمیں شدت سے محسوس ہوئی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اسی احساس اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی کوچہ گری کی مرہون منت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور میری برادری کے طالب جانوں کو اس سے کماحقہ استفادہ کرنے اور اپنی دعوتی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب الصامتین و الناطقین!

زیرِنظر کتاب میں خطابت کے قدیم رہنما اصولوں کے ساتھ جدید تحقیقات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور......اور اصل بات تو دردِ دل کی ہے۔ اگر ایک فاضل یا طالب کے دل میں یہ درد ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی ادا کرے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو بد دین یا بے دین داعیوں کے چنگل میں پھنسنے سے بچائے تو ان چند رہنما اصولوں کے ذریعے وہ

اپنی تربیت چند روز کی مشق سے خود کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو اور ہمیں اپنے دین کی خدمت، اشاعت اور تحفظ و دفاع کے لیے دیر اور دور تک عافیت و سلامتی کے ساتھ قبول فرمائے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

شاہ منصور

۲۸ / ربیع الثانی، ۱٤۲۸ھ

خطابت کیا ہے؟

تعریف:

خطابت کے لغوی معنی ہیں: وعظ کہنا۔ خطبہ پڑھنا۔

علامہ ابن رشد اپنی کتاب "تلخیص الخطابہ" میں فرماتے ہیں: "خطابت نام ہے اس فن کا جس کی مدد سے اپنی بات دوسرے سے کہی اور منوائی جا سکتی ہے۔"

گویا اس سے مراد وہ بیان ہے جو دلوں کو گرمانے، کسی بات کو واضح کرنے، کسی امر کا یقین دلانے، اثر پیدا کرنے، ترغیب دینے یا سامعین کو کسی خاص عمل یا روش پر آمادہ کرنے میں مدد دے۔

خطابت بے حس قوموں کو چونکاتی ہے، مردہ جذبات کو جگاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، دکھ میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے، گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔ یہ عوام کے جمگھٹوں کو پر کیف، غم و مسرت کی محفلوں کو کامیاب اور دینی و سیاسی جلسوں کو پُر لطف بنا دیتی ہے۔

مقصد:

خطابت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچایا جائے، افراد کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے اور انہیں ایک نشانِ منزل دے کر یکسو کیا جائے تا کہ پوری اُمت کا ہدف ایک ہی ہو، منزل ایک ہی ہو اور اس کا حصول ہی اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن جائے۔ جو شخص قوم کے اندر یہ ولولہ، یہ عزم، ایثار و قربانی کا یہ جوش و جذبہ پیدا

کردے وہ کامیاب مقرر ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ فنِ خطابت صرف اور صرف ''وہبی'' ہے اور کوشش ومحنت کے ذریعے سے اسے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح ہر انسان قدرت کی طرف سے صدہا کام کرنے کی کم یا زیادہ استعداد لے کرآتا ہے، اسی طرح تقریر کرنے کی صلاحیت بھی لے کرآتا ہے۔ انسان جس طرح مسلسل مشق، محنت اور کوشش کے ذریعے اپنی تمام صلاحیتوں کو ترقی دے کر درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے، بالکل اسی طرح تقریر کرنے کی استعداد کو بھی مسلسل مشق سے اوجِ کمال تک پہنچایا جاسکتا ہے اور سامعین کو اپنے خیالات سے متاثر کیا جاسکتا ہے۔

اچھے مقرر تو مجمع پر بالکل جادو سا کر دیا کرتے ہیں۔ ان کے قوتِ بیان اور زورِ زبان کے آگے بڑے بڑے بہادروں کی تلواریں بے کار ہوکر رہ جاتی ہیں۔ تاریخ عالم ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہے کہ ایک فردِ واحد نے اپنی جادو بیانی کے زور سے ہزارہا انسانوں کے دلوں اور دماغوں کو مسخر کرلیا اور اس کے ایک اشارے پر انہوں نے اپنی جانیں تک قربان کرڈالیں۔ سحر طراز خطیبوں کی پُر جوش تقریروں سے وہ انقلاب بپا ہوا کہ مضبوط و مستحکم حکومتیں اُلٹ گئیں۔ خطابت کی اس تاثیر اور فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اللہ کی رضا کے لیے یہ فن سیکھنا چاہیے اور ساری انسانیت تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے اس فن کو اس کے اصول وقواعد کے مطابق استعمال کرنا چاہیے تاکہ جنابِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تمام انبیائے کرام کی نیابت کا فریضہ ادا ہوسکے اور آپ کی اُمت کی دنیاوی واخروی صلاح و فلاح کے لیے ہر طالب علم اور ہر عالم اپنا کردار ادا کرسکے۔

عربوں کی خطابت

عربوں کے ہاں تحریر کا فن بہت دیر بعد آیا لیکن اُن میں تقریر کا ملکہ شروع سے تھا۔ انہیں اپنی زبان، اپنے حافظہ، اپنی خطابت اور اپنی شاعری پر اس قدر ناز تھا کہ اپنے سوا تمام دنیا کو عجم (گونگا) سمجھتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو شروع ہی میں خطابت کی تعلیم دیتے اور یہ ان کی تربیت کا جزوِ لازم تھا۔ وہ نوشت وخواند سے آگاہ نہ تھے لیکن خطابت کی تعلیم وتربیت میں لوازم ومناسبات کو ملحوظ رکھتے۔ مثلاً: اسلوبِ بیان دلکش ہو۔ سحر بیانی قائم رہے۔ الفاظ بوجھل نہ ہوں۔ سلیس اور خوبصورت ہوں۔ صاف لہجہ ہو۔ کھلی باتیں ہوں۔ ہم وزن مسجع جُملے اور ہم وزن سریع الفہم ضرب الامثال استعمال کی جائیں۔ ہر خطبہ، ایجاز واختصار کے ساتھ جامع ومانع ہو۔

ہر قبیلہ کوشاں ہوتا کہ اُن میں خطیب وشاعر ضرور پیدا ہو۔ اُس زمانہ میں اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ یہی دو وصف (خطابت وشاعری) عربوں کے لیے افتخار وعزت کا سرمایہ تھے اور انہی کے بل پر وہ تمام دنیا کو گونگا خیال کرتے اور کسی دوسری زبان کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

اس کتاب میں ہم اہلِ عرب اور خطبائے اسلام سے استفادہ کرتے ہوئے فنِ خطابت کے اصول وقواعد دے رہے ہیں تاکہ انسان ان تمام چیزوں کا احاطہ کر سکے جن کو یہ فن اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان خطبات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کی کامیاب خطابت کا عنصر صرف فطری جوش ہی نہ تھا بلکہ وہ اس کے تمام اصول وقواعد سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھے۔ اور وہ اس مدلل انداز سے اپنے موقف کو پیش کرتے تھے کہ فریق مقابل ان کے زورِ زبان اور قوتِ استدلال سے اپنے آپ کو مجبور پا کر پسپا ہو جاتا تھا۔

اہلِ عرب اور مسلمان خطبا کے علاوہ اہلِ مغرب کے یہاں مروّج اصول وآدابِ تقریر سے بھی اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے تاکہ مشرق ومغرب دونوں کی صفات وخصوصیات اپناتے ہوئے فنِ تقریر کے مقصدِ اصلی یعنی دعوت وتبلیغ کو آسانی اور کامیابی سے حاصل کیا جا سکے۔

خطابت کی ضرورت واہمیت

تحریر کے مقابلے میں تقریر زیادہ ضروری ہے:

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ تحریر سے تو نفع خاص ہوتا ہے یعنی صرف طلبہ اور پڑھے لکھے لوگوں کو اور تقریر کا نفع عام ہوتا ہے جن میں خاص بھی داخل ہیں۔ غرض بیان کی دو صورتیں ہیں: ایک درس جس کا نفع خاص طلبہ کو ہے اور ایک وعظ جس کا نفع عوام کو ہے اور ان دونوں قسموں کا فائدہ اس پر موقوف ہے کہ قوت بیانیہ بقدر ضرورت حاصل ہو پس ہمارے طلبہ کو اس وقت ان دونوں کی تحصیل اور مشق کی ضرورت ہے۔"(۱)

ایک اور جگہ علمائے کرام کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دو باتیں خیال میں آتی ہیں یا تو درس و تدریس شروع کریں یا وعظ کہیں اور ان دونوں میں وعظ ہی زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا نفع عام ہوتا ہے اور جس بات کے لیے ضرورت دیکھی جائے وہی بیان کی جا سکتی ہے، لیکن وعظ گوئی بڑی محنت کا کام ہے۔ ضرورت دونوں کی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ مستقل درس کا شغل رہے اور کبھی کبھی وعظ بھی ہوا کرے"۔(۲)

وعظ و تقریر کے متعلق اہل علم کی کوتاہی:

جو علمائے کرام وعظ کہنے سے کتراتے ہیں ان کو نصیحت کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا:

۱- دعوات عبدیت: ۱۱۲/ ۱۲۷

۲- حسن العزیز: ۴/ ۷۲

"ایک کوتاہی تو وعظ نہ کہنے کی ہے۔ اکثر اہل علم کو دیکھا ہے کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں بلکہ اس سے نفرت اور اس کی تحقیر کرنے والے ہیں اور اس سے عار کرتے ہیں اور وعظ کہنے کو شانِ علم کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ عظیم خطا ہے۔

تعلیمِ دین کا اصل طریقہ جس کے واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے یہی وعظ وارشاد ہے جس کے ذریعہ سے وہ دین کی تبلیغ فرماتے تھے۔ باقی درس وتالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہیں کیونکہ سلف میں حفظ وتدوین کے اہتمام کی وجہ سے صرف زبانی روایت اور عام خطبات پر قناعت اور اعتماد کیا جاتا تھا، بعد میں علوم کی حفاظت کے لیے درس وتالیف کی ضرورت ہوئی پھر اس حفظ سے ظاہر ہے کہ مقصود وہی تبلیغ اور زبانی خطاب ہے جس کی عام قسم کو وعظ کہا جاتا ہے، پس اس تمام تر درس وتالیف کے اشتغال سے مقصود بالذات وعظ ہی ٹھہرا، پس مقصود بالذات کی اماتت (اس کو مردہ کرنا) کتنی بڑی خطا ہے!؟" (۱)

فرمایا کہ: "وعظ جس سے عام اصلاح ہو اس زمانہ میں میرے نزدیک نہایت ضروری کام ہے بلکہ درس وتدریس سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ درس وتدریس اسی (وعظ) کے لیے ہے اور انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت بھی اسی لیے ہوئی ہے۔" (۲)

میرے پاس روپے نہیں ورنہ کم سے کم ایک ہی واعظ بابرکت اور خوش بیان ملازم رکھ لیتا۔ جہاں ضرورت ہوا کرتی اس کو بھیج دیا کرتا۔ اگرچہ علما اس کام کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن یہ تحقیر ایسی ہے جیسے کہ حکمائے یونان انبیاء علیہم السلام کو حقیر سمجھتے تھے۔" (۳)

علماء کو وعظ وتبلیغ کی ترغیب:

"علماء نے آج کل یہ کام بالکل چھوڑ دیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کا کام تھا، اس لیے آج کل واعظ زیادہ تر جہلا نظر آتے ہیں۔ علماء بہت کم واعظ ہیں تو آپ نے اصل مقصود کے

۱- حقوق العلم: ص ۹۳
۲- مزید المجید ص ۶۵
۳- العبد الربانی: ص ۱۱۵

علاوہ جس چیز کو مقصود بنادیا تھا اس کی بھی تکمیل نہیں کی۔ اس کا بھی ایک شعبہ لے لیا یعنی تعلیم ودرسیات اور دوسرا شعبہ تعلیم عوام کا چھوڑ دیا۔

صاحبو! اگر علماء عوام کی تعلیم نہیں کریں گے تو کیا جہلا کریں گے؟ اگر جہلا یہ کام کریں گے تو وہی ہوگا جو حدیث میں " اتخذوا رؤساً جهالا، فضلّوا وأضلّوا ." "کہ یہ جہلا، مقتدا و پیشوا شمار ہوں گے۔ لوگ انہی سے فتویٰ پوچھیں گے اور یہ جاہل خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اس لیے علماء کو تعلیم درسیات کی طرح وعظ و تبلیغ کا کام بھی کرنا چاہیے اور اس کا انتظار نہ کرو کہ ہمارے وعظ کا اثر ہوتا ہے یا نہیں اور کوئی سنتا بھی ہے یا نہیں اور سننے والا مجمع ہے یا ایک؟" (۱)

وعظ و تقریر علماء کا منصبی فریضہ ہے:

"وعظ تو ہمارا فرض منصبی ہے۔ یہ کام تو ہم کو عوام کی خواہش کے بغیر بھی کرنا چاہیے۔ خوشامد کرانے کی کبھی عادت نہیں ہوئی۔

یہ ہمارا کارِ منصبی ہے اور ہم اور کسی کام کے تو ہیں نہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوا تو ہمارا وجود عدم برابر ہے اور جب یہ ہمارا کارِ منصبی ہے تو اس کے لیے کسی خوشامد یا سفارش کا انتظار کرنا چہ معنی؟ اگر کوئی درخواست نہ کرے جب بھی ہم کو یہ کام کرنا ہے اور درخواست کرنے پر تو کسی طرح اس سے انکار نہ ہونا چاہیے۔" (۲)

ہر مدرسہ میں ایک واعظ ہونے کی ضرورت اور اس کا فائدہ:

"وعظ کو اس لیے بھی اختیار کرنا چاہیے کہ جس چیز کو آپ آج کل مقصود سمجھے ہوئے

---

۱ - وعظ العلم والخشیۃ: ص ۳۳
۲ - حاشیہ: حسن العزیز: ۲۶۱/۱۹۸/۴

ہیں یعنی درس وتدریس، خود اس کے لیے بھی یہ بہت معین ومفید ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علماء کو آج کل مدارس کی طرف بہت توجہ ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ علوم اسلامیہ کے بقا کی یہی صورت ہے اور اسی کے لیے وہ چندے وغیرہ کرتے ہیں اور مدارس کا زیادہ تر مدار چندہ پر ہے اور چندہ دینے والے زیادہ تر عوام ہیں۔ تو علماء کو چاہیے کہ عوام کو اپنی طرف مائل کریں۔ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ صرف وعظ وتبلیغ کے لیے رکھا جائے، جس کا کام صرف یہ ہو کہ احکام کی تبلیغ کرے اور اس کو ہدیہ لینے سے قطعاً منع کر دیا جائے اور استحساناً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کے لیے بھی چندہ نہ کرے۔ بلکہ اگر کوئی خود بھی دے تو قبول نہ کرے بلکہ مدرسہ کا پتہ بتلا دے کہ اگر تم کو بھیجنا ہو تو اس پتہ پر بھیج دو۔

واعظ کو محصلِ چندہ نہ ہونا چاہیے۔ محصلِ چندہ اور لوگ ہوں گے۔ واعظ کا کام صرف وعظ کہنا ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے وعظ میں جب چندہ کا ذکر نہیں ہوگا تو بے غرض وعظ ہوگا۔ اس کا مخاطب پر بڑا اثر ہوتا ہے پھر عوام کا مدرسہ سے تعلق ہوگا کہ اس مدرسہ سے ہم کو دین کا نفع پہنچ رہا ہے اس کی امداد کرنا چاہیے اور آج کل تو عوام کو یہ بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب! ہم کو مدرسہ سے کیا نفع؟ بس عربی پڑھنے والوں ہی کو کچھ نفع ہوگا اور واقعی ایک حد تک یہ اعتراض بھی صحیح ہے۔ اس لیے جن عوام سے آپ چندہ لینا چاہتے ہیں ان کو بھی تو کچھ نفع پہنچنا چاہیے۔ جس کی صورت میں نے بتلا دی کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ صرف وعظ کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر ہر مدرسہ میں ایک ایک واعظ ہو جائے تو پھر دیکھیے عوام کا مدرسہ سے کیا تعلق ہوتا ہے اور چندہ کی بھی کیسی کثرت ہوتی ہے؟ یہ چلتے ہوئے نسخے ہیں۔ اگر شبہ ہو تو تجربہ کر کے اس کے نفع کا مشاہدہ کر لیجئے۔ میں اہل مدرسہ سے کہتا ہوں کہ امتحان کے طور پر کچھ

عرصے کے لیے اس پر عمل کر کے دیکھ لو۔ اگر تمہارے مدرسہ کو اس سے نفع نہ ہو تو اس کام کو بند کر دینا ہر وقت تمہارے اختیار میں ہے۔" (۱)

دینی مدارس میں تحریر و تقریر سکھانے کا انتظام ضروری ہے:

اکثر مدارس میں طلبہ کی تقریر و تحریر کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ اس میں اہل علم کو عاجز ہونا ان کی منصبی خدمات کا ضعیف ہونا ہے اس لیے اس کا خاص انتظام واہتمام ضروری ہے۔

اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دیگر عام تعلیم کی طرح خوش تحریری وخوش تقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے اس طریقہ پر کہ وہ طلبہ کا اختیاری امر نہ رہے بلکہ سب کو اس امر پر مجبور کیا جائے۔ (۲)

طلبہ کو تقریر کی مشق کرانے کی ضرورت:

"ایک ذریعہ تقریر کا اور ہے، یعنی تقریر کی مشق، وہ بھی کیجیے۔ بحمد اللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور مدرسہ میں اسباب بھی موجود ہیں۔ اس کو غنیمت سمجھیے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا اور وقت بھی بعد میں نہ ملے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کر دو بلکہ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھ کر حاصل کرو۔ اصل مقصود دین ہے مگر اس کے مختلف طریقے ہیں۔

صاحبو! ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہ آئے گا اور وقت بھی نہیں ملے گا۔ اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ آج کل اس کی بہت ضرورت ہے۔

ہمارا کمال اس وقت تک ہے جب تک مدرسے کے اندر ہیں۔ مدرسہ کے اندر سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے تو کچھ بھی نہیں۔" (۳)

۱- العبد الربانی ملحقہ حقوق وفرائض: ص ۱۱۷
۲- تجدید تعلیم: ص ٤٤
۳- آداب التبلیغ: ص ۱۲۱

طلبہ کو تقریر سکھانے کا ایک طریقہ:

"میں نے اپنے یہاں یہ انتظام کیا ہے کہ اگر کوئی کافیہ پڑھنے والا ہے تو کافیہ ہی کا کوئی مضمون دے دیا کہ اس کی تقریر کرو۔ اگر مشکوٰۃ پڑھ چکا ہے تو کوئی حدیث اسی وقت دے دی کہ اس کی تقریر کرو۔ اس سے زبان بھی کھل جاتی ہے یعنی بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور پڑھانے کا ڈھنگ بھی آ جاتا ہے اور تعلیم کا نقصان بھی نہیں ہوتا"۔ (۱)

"ایک بار مجھ سے درخواست کی گئی کہ طلبہ جمعرات کو کچھ تقریریں کیا کریں۔ میں نے اس صورت سے منظور کیا کہ اپنی درسی کتابوں کو ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاؤ اور ان کے مضامین کی تقریر کردو۔ مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور مفاسد سے بھی محفوظ رہیں گے۔"

علماء کے لیے تقریر سیکھنے کی آسان تدبیر:

"بعض علماء یہ عذر کر دیتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو عربی پڑھنا بھی کب آتا تھا؟ یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے۔ اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجیے اور کچھ دنوں محنت کیجیے۔ یہ کام بھی آ جائے گا۔

جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ شروع شروع میں طلبہ کے سامنے مشکوٰۃ شریف وغیرہ لے کر بیٹھ جاؤ اور کتاب دیکھ کر بیان کرو۔ پھر کچھ دنوں میں بغیر کتاب کے بیان شروع کرو۔ اس طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جاہلوں کو تو وعظ کی جرأت ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو! جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہ اب جہلا، علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے۔" (۲)

کتاب دیکھ کر وعظ کہنا:

فرمایا: "کتاب دیکھ کر وعظ کہنے کا معمول مولانا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا سنا ہے کہ وہ

۱- کلمۃ الحق: ص ۱۲۴
۲- العبد الربانی: ص ۱۱۱

کتاب سے وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اس صورت سے وعظ کہنے سے دماغ پر تعب نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے میں نے چند روز تک وعظ کی یہ صورت اختیار کی تھی کہ کتاب دیکھ کر بیان کردیا کروں مگر اب دماغ اس کا بھی متحمل نہیں۔" (۱)

بے عمل عالم کو بھی وعظ کہنا چاہیے:

"یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہ ہو تو وعظ ہی نہ کہے جیسا کہ بعض لوگوں کو اس میں بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس شخص کو عمل کی کوشش کرنی چاہیے اور وعظ ترک نہ کرنا چاہیے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ واعظ بنے تو عمل کا اہتمام نہیں اور اگر عمل کے لیے کہا گیا تو وعظ ہی چھوڑ دیا کہ عمل تو ہوتا نہیں وعظ کیا کہیں؟

اور اگر وعظ سننے والے بھی یہی کہیں کہ جب عمل نہیں ہوتا تو سُن کر کیا کریں تو پھر کیا ہو دین کا؟ یہ باب ہی مسدود ہو جائے۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

ایک مرتبہ ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بعض لوگ تو یہاں تک غلطی میں ہیں کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً ممنوع سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کا مستدل یہ ارشاد ہے: "لم تقولون مالا تفعلون؟ کبر مقتا عنداللہ أن تقولوا مالا تفعلون".

ایک دوسری آیت میں ہے جو اس سے بھی صاف ہے: "أتأمرون الناس بالبر و تنسون أنفسکم؟" پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت ناپسند ہے کہ وہ کہو جو کرو نہیں۔"

۱- الافاضات: ۲/۲۳۵

اور دوسری آیت میں تو ظاہراً بلا عمل نصیحت کرنے ہی پر تصریحاً رد ہے اس لیے اگر اس سے شبہ پڑ جائے تو بعید نہیں۔

پہلے اس آیت کو سمجھ لیجئے جس میں ظاہراً اس کا صریح ذکر ہے مگر اس کے بھی یہ معنی نہیں کہ "ناسی نفس" یعنی بدعمل کا وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ واعظ کو نسیانِ نفس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وعظ تو کہو مگر بدعمل مت بنو بلکہ جو نصیحت دوسروں کو کرتے ہو وہ اپنے نفس کو بھی کرو اور اس کو بھی عمل کراؤ۔

اب رہا یہ شبہ کہ ہمزہ استفہام انکاری تو تأمرون پر داخل ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ناسی نفس" (یعنی بدعمل کو) امر بالبر یعنی وعظ کی ممانعت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل علم جانتے ہیں کہ ہمزہ کا مدخول دونوں جملوں کا مجموعہ ہے تو مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور بدعملی کو جمع نہ کرو تو باحتمال عقلی اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ امر بالمعروف تو کرو مگر بدعملی نہ کرو۔ ایک یہ کہ اگر بدعملی کا وقوع ہو تو پھر امر بالمعروف نہ کرو۔ تو لوگوں نے اس کا مطلب اسی دوسری صورت کو سمجھا کہ عمل بد میں مبتلا ہو تو وعظ کو چھوڑ دو مگر یہ اس لیے غلط ہے کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے۔ دوسرے دلائل سے اس کا احتمال نہیں رہتا اور اگر فرضاً احتمال ہو تو تمہارا استدلال اس سے جاتا رہا۔ اب رہی پہلی آیت: "لم تقولون مالا تفعلون؟" تو یہاں تقولون کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں قول کے دو معنی ہیں یا یہ کہو کہ قول کی دو قسمیں ہیں: ایک قول انشائی، ایک قول خبری۔ قول خبری یہ کہ تم بذریعہ قول کسی بات کی خبر دیتے ہو ماضی کی یا مستقبل کی اور قول انشائی یہ کہ خبر نہیں بلکہ کسی بات کا امر و نہی کرتے ہو تو یہاں پر قولِ انشائی مراد نہیں قول خبری یعنی ایک دعویٰ مراد ہے۔ چنانچہ اس کا شان نزول یہ ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ ہم کو اگر کوئی ایسا عمل معلوم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل و محبوب ہو تو ہم ایسی ایسی کوششیں کریں۔ پھر قتال کا

حکم نازل ہونے پر بعض لوگ جان بچانے لگے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ پس اس دعویٰ کے متعلق ارشاد ہے کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں؟ سو اس آیت میں دعوے کا قول مراد ہے۔ نصیحت کا قول مراد نہیں۔

چنانچہ انہی آیتوں میں اس کا قرینہ بھی ہے۔ "إنَّ اللّٰه یحبُ الذین یقاتلون فی سبیله......"

حضرت مجدد الملت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام ارشادات سے وعظ و خطابت کی اہمیت پتا چلی۔ عزیز طلبہ کو چاہیے کہ اپنی اصلاح کی فکر کے ساتھ ساتھ وعظ کہنے اور بیان کرنے کی مشق کرتے رہا کریں تاکہ ہم میں عالم ربانی کی صفات پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سب سے دین کا خوب خوب کام لیں۔

خطابت کی اقسام

پہلی تقسیم:

بنیادی طور پر خطابت کی چار قسمیں ہیں جو فنی اعتبار سے درجہ بدرجہ بالترتیب یوں ہیں:

(۱) مکتوبی (۲) حفظی (۳) اعدادی (٤) ارتجالی (فی البدیہہ)

۱-خطابت مکتوبی:

اس سے مراد وہ تقریر ہے جو پہلے سے لکھ لی گئی ہو اور سامعین کے سامنے پڑھ دی جائے۔ اس میں کسی ایسی بات کے زبان سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا جسے کہنا مقصود نہ ہو، لیکن یہ بالکل سطحی اور ابتدائی نوع ہے۔

۲-خطابتِ حفظی:

اس سے مراد وہ خطابت ہے جو تحریر کی مدد سے نہیں، حافظے کے وسیلے سے دہرائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسے رٹی ہوئی تقریر کہتے ہیں۔ یہ قسم فنی اعتبار سے مبتدی کی مشق کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن اصل فن میں اس کی چنداں حیثیت نہیں۔ فنِ خطابت کا اظہار اگلی دو قسموں میں ہوتا ہے۔

۳-خطابتِ اعدادی:

یہ وہ خطابت ہے جس میں مواد اکٹھا کر کے پہلے سے تقریر کا ذہنی خاکہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ اکثر مقرر آسانی اور سہولت کے خیال سے اہم نکات کو کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ لیتے ہیں اور دورانِ تقریر اس پر نظر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس میں نہ تو تقریر کو لکھ کر حرف بحرف پڑھ دیا جاتا

ہے اور نہ لکھی ہوئی تقریر کورٹ کر سنایا جاتا ہے۔ یہ پہلی دو قسموں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔

٤- خطابتِ ارتجالی:

فی البدیہہ تقریر کو کہتے ہیں یعنی کسی موضوع پر بغیر کسی تیاری کے دفعتاً بر جستہ بولنا۔ ارتجالی خطابت انسان کو دی گئی نعمتِ نطق کا نقطۂ کمال ہے۔ یہ عوام الناس کو متاثر کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ ہے۔ تبلیغ کے لیے بھی یہ بہت مفید ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامیاب مواعظ مبارکہ میں جو قوت پائی جاتی تھی وہ ارتجالی خطابت کی غیر معمولی تاثیر کا نقطۂ عروج تھی۔ یہ معجزانہ قوت آپ کے خلوص، یقین، جوشِ ایمان اور دلی تڑپ سے دو چند ہو جاتی تھی۔

ممتاز مقتدر مذہبی وسیاسی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری اور تبلیغ کے اکابر ''ارتجالی خطابت'' کرتے تھے اور اس میں انہیں یدِطُولٰی حاصل تھا۔

وعظ اور بیان کی مشق عموماً تیسرے طریقے سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ چوتھی قسم جو اصل کمال اور مقصود ہے، پر عبور حاصل ہو جاتا ہے، لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ مبتدی کو خطابتِ اعدادی کی ہمت نہ ہو رہی ہو تو اساتذہ اور نگران حضرات پہلی یا دوسری قسم سے مشق کی ابتدا کرواتے ہیں اور رفتہ رفتہ تیسری قسم پر لے آتے ہیں۔

دوسری تقسیم:

خطابت اور وعظ کی ایک تقسیم موضوع کے لحاظ سے ہے۔ اس اعتبار سے بھی اس کی چار قسمیں بنتی ہیں:

١- درسِ قرآن وحدیث ٢- اصلاحی بیان ٣- علمی وفکری خطاب (لیکچر) ٤- عام تقریر

☆......درسِ قرآن وحدیث کسی آیت وحدیث کے ترجمہ وتشریح، نکات ومعارف اور اس سے ملنے والی حکمت وموعظت، عبرت ونصیحت یا سبق وہدایت پر مشتمل ہوتا ہے۔

☆......اصلاحی بیان، عقائد واعمال کی اصلاح، بدعات ورسومات کی تردید، رسوم

ومنکرات چھڑوانے کے لیے کی گئی مخلصانہ دعوتی کوشش کو کہتے ہیں۔ اخلاق حسنہ کے حصول کی ترغیب اور عادات رذیلہ چھڑوانے کے لیے اس سے بہتر ذریعہ نہیں۔ علمائے اسلام نے اپنی اصلاحی ودعوتی کاوشوں کو اسی کے ذریعے کامیاب بنایا ہے۔

☆......علمی وفکری نشست سے خطاب خالصتاً علمی وفکری کاوش ہے۔ اس میں سطحیت وجذباتیت کا گذر نہیں۔ اس میں مقرر اپنے وسیع مطالعہ اور اعلیٰ ذہنی قوتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاریخی وزمینی حقائق، اہل علم کی آراء اور مستند اعداد وشمار کی مدد لیتے ہوئے مدلّل تجزیے اور جاندار تبصرے اور کارآمد تجاویز کے ذریعے سامعین کی علم ودانش میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کے ذہن وفکر کو ایک رخ دیتا اور لائحہ عمل تجویز کرتا ہے۔ عام طور پر سیمینار، کانفرنس یا فکری نشست سے خطاب کو اس کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

☆......عام تقاریر میں دینی وسیاسی بیانات، اجتماعات وجلوس سے خطاب اور مختلف محافل ومجالس میں کی جانے والی وعظ وتقاریر آتی ہیں۔ جمعہ کے بیانات کو بھی اسی نوع میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس ہفتہ واری مجلس میں معلومات کی فراہمی سے زیادہ احوال کی اصلاح عوام کے لیے زیادہ مفید اور مؤثر ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں ملکی حالات پر تبصروں کی بجائے عوام کی دینی ذہن سازی اور مذہبی اصلاح وترقی کا کام لینا چاہیے۔

یوں تو ان اقسام کے آداب واصول ملتے جلتے ہیں۔ بس موضوع اور غرض وغایت کے لحاظ سے تھوڑا بہت فرق ہے۔ ایک پر دسترس حاصل کر لینے سے دوسرے پر بھی عبور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پہلی تین اقسام چونکہ خصوصی آداب کی متقاضی ہیں اس لیے کتاب کے آخر میں ان تینوں پر الگ سے بحث کی گئی ہے۔ درسِ قرآن وحدیث کی تیاری کے حوالے سے دو مستقل باب دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد فکری خطاب کی تیاری کے لیے ''لیکچر کی تیاری'' کے عنوان سے ایک مضمون دیا گیا ہے۔

تقریر کی تیاری کے پانچ مراحل

جب آپ کو کسی موضوع پر تقریر کرنے کو کہا جائے تو اس کی تیاری کے لیے بالترتیب ذیل کے پانچ مراحل پر عمل کیجیے۔ان شاءاللہ اچھی تقریر تیار ہو جائے گی۔

۱-مواد کی فراہمی:

اس حوالے سے بندہ اپنی کتاب ''تحریر کیسے سیکھیں؟'' کے پانچویں باب میں ''تحریر کا مواد حاصل کرنے کے ذرائع'' کے عنوان سے تفصیلی گفتگو کر چکا ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس موضوع کے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات، بزرگان دین کی حکایات، منفرد اور اچھوتے نکات اور ذاتی مشاہدات و تاثرات ترتیب وار جمع کریں۔ پھر موضوع کی مناسبت سے ایک آدھ لطیفہ، چٹکلہ اور تین چار اشعار تلاش کرلیں تاکہ انہیں مناسب جگہ ٹانکا جا سکے۔ اس کام کے لیے آپ کو دو چیزیں کام آئیں گی: ذاتی یادداشتیں اور کتابیں۔

- ذاتی یادداشتیں:

خطابت کی بنیاد علم ہے اور یادداشتیں انسان کے لیے علم کا سرمایہ ہوتی ہیں۔تقریر یا تحریر سیکھنے کی خواہش رکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ''جرنل'' یا ''نوٹ بک'' (بیاض) ہر وقت اپنے پاس رکھے۔ اس بیاض میں مختلف حوالہ جات، خیالات (آئیڈیاز)، تجربات، واقعات اور منتخب حکایات و لطائف درج کرتا رہے۔ کسی بھی موضوع سے متعلق تقریر تیار کرتے وقت مقرر کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ

اپنی ان ذاتی یاداشتوں کو ٹٹولے، کھرچے اور کریدے۔ ذہن کے نہاں خانوں میں موضوع سے متعلق اسے بہت سا مواد اور اشعار بکھرے پڑے ملیں گے۔ ان سب کو وہ احاطہ تحریر میں لے آئے۔

– کتابیں اور کمپیوٹر:

دوسرے مرحلہ میں وہ اپنے وسعتِ مطالعہ پر نظر دوڑائے کہ متعلقہ موضوع پر اس نے کن کن کتب اور کن کن رسائل میں کچھ پڑھا تھا؟ ممکن ہو تو دوبارہ ان کتب سے استفادہ کرے۔ ورنہ جو کچھ یاد ہے اسے ہی آئینہ تحریر میں اتارے۔ مزید مطالعہ کے لیے وہ اپنے ادبی دوستوں اور اساتذہ و اہل علم سے راہنمائی حاصل کرسکتا ہے کہ اسے کون سی کتب پڑھنی چاہییں؟

کتابوں کے علاوہ رسائل و جرائد، انسائیکلو پیڈیا، سی ڈیز اور انٹرنیٹ سے بھی مطلوبہ مواد تلاش کی جاتا ہے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے تین چیزیں مزید منتخب فرمالیں تاکہ تقریر کے لیے درکار مواد مکمل ہو جائے۔

ایک تو مختصر و منفرد الفاظ پر مشتمل خطبہ، دوسرے غیر روایتی اور خوبصورت الفاظ پر مشتمل آغاز، تیسرے تقریر کے خلاصے اور واضح پیغام پر مشتمل بامعنی اور دلکش اختتام۔ یہ تین چیزیں بھی اگر متاثر کن اور معیاری ہیں تو سمجھیے کہ آپ نے پچاس فیصد کام کامیابی سے مکمل کرلیا ہے۔

اب ذرا یادداشت پر نظر دوڑائیے۔ آپ کے پاس بالترتیب یہ دس چیزیں جمع ہو چکی ہیں جو کسی بھی اچھی تقریر کے بنیادی عناصر ہوتی ہیں:

١- خطبہ (مختصر و منفرد)
٢- افتتاحی الفاظ (غیر روایتی)

٦- کوئی منفرد خیال یا اچھوتا نکتہ
٧- ذاتی مشاہدات و تاثرات

۳- آیات قرآنیہ
۴- احادیث نبویہ
۵- مستند واقعات
۸- لطائف، چٹکلے
۹- موضوع سے متعلق معیاری اشعار
۱۰- بامعنی اور خوبصورت اختتام

یاد رکھیے! یہ سب چیزیں ہر تقریر میں لازمی نہیں لیکن اچھی اور معیاری تقریر کا قوام بنیادی طور پر انہی دس عناصر سے تیار ہوتا ہے۔

ایک چبھتا ہوا سوال:

ممکن ہے یہاں پہنچ کر طالبعلم کے دل میں سوال پیدا ہو کہ کسی مقابلے میں شریک تمام ہی امیدوار یہی چیزیں تیار کر کے لائیں گے تو میری کامیابی کی کیا ضمانت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ضمانت دو چیزوں میں ہے: انفرادیت اور مشق۔

یعنی آپ نے آغاز غیر روایتی انداز میں کیا، الفاظ کے انتخاب میں سلیقے کا مظاہرہ کیا۔ کوئی ایسا منفرد نکتہ یا اچھوتا خیال پیش کیا جس تک دوسروں کا ذہن نہیں پہنچ سکا۔ آپ کا لہجہ پر اعتماد اور انداز و اطوار اصولوں کے مطابق تھے تو یہ سب چیزیں مل کر آپ کو سبقت دلا سکتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی مشق کیسی تھی؟ جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی یا نہیں؟ اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے، آپ تقریر کو پکاتے اور رواں کرتے تھے یا نہیں؟ یہ چیز ایسی ہے جو (اس مرتبہ نہیں تو اگلی مرتبہ) کامیابی کا تاج آپ کے سر پر سجا کر چھوڑے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

۲- خاکہ سازی:

اس مرحلہ میں طالبعلم جو کچھ جمع کر چکا ہے اس کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔ حسن ترتیب کے بغیر مقرر کو پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ اسے بات کہاں سے شروع کرنی ہے اور کس موڑ پر جا کر ختم کرنی ہے؟ خاکہ مرتب کئے بغیر مائیک کے سامنے جانا اندھیرے کمرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات ہے۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ خطیب خواہ

کتنا بڑا عالم اور صاحب مطالعہ شخص ہی کیوں نہ ہو، کم از کم اپنے ذہن میں کوئی خاکہ مرتب ضرور کر لیتا ہے تاکہ اس خاکے مطابق بات آگے بڑھاتا چلا جائے۔

۳۔ قلم بندی:

اب آپ کو اس خاکہ میں رنگ بھرنا ہے۔ تقریر کو تحریری صورت میں لانا ہے۔ کسی مقابلے میں حصہ لینے والے ایسا کرتے ہوئے تقریر کے ابتدائیہ، مرکزیہ اور اختتامیہ کے مطابق الفاظ اور مواد مرتب کریں۔ موضوع سے خارج یا کم مطابق مواد کو حذف کردیں۔ طالب علم مقررین کے لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ وہ موضوع کے عین مطابق باتوں کو باقی رکھیں اور غیر متعلق سب باتیں قلم زد کردیں۔ کیونکہ مقابلے کی تقریر میں ان کے پاس سات آٹھ منٹ سے زیادہ وقت نہ ہوگا۔ تقریر ایک مرتبہ تحریر میں لانے کے بعد اس پر غور وفکر کریں۔ نامناسب الفاظ،، کمزور ترکیبوں اور استعاروں کو نکال باہر کریں اور ان کو زیادہ موزوں الفاظ اور ترکیبات کے موتیوں سے سجائیں۔ یوں آپ کا تقریر نویسی کا مرحلہ طے ہوگیا۔

٤۔ ذہن نشینی:

اس مرحلہ سے آپ اپنے آپ کو سامعین کے سامنے لے جانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اگر آپ تھوڑے تجربہ کار ہیں تو تقریر کو ذہن نشین کر لینا ہی کافی سمجھیں اور اس کی مشق شروع کردیں، لیکن اگر آپ بالکل نئے ہیں تو پھر آپ کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ شروع کی چند تقاریر یا ان کا اکثر حصہ لفظ بہ لفظ یاد کر کے ہی سامعین کے سامنے جائیں۔ اس طرح آپ خود کو زیادہ پُر اعتماد محسوس کریں گے۔

مقررین کے لیے ضروری ہے کہ ایک آدھ تقریر کر لینے کے بعد جب سامعین کا سامنا کرنے کا خوف دور ہوجائے تو رٹے لگا کر تقریر کرنے کی عادت تو بالکل چھوڑ دیں لیکن

ضروری ہے کہ تقریر کا خلاصہ اور خاص خاص نکات کسی چھوٹے کاغذ پر لکھ کر تنہائی میں بیٹھ کر ذہن نشین کرنے اور مرتب انداز میں پیش کرنے کی کوشش اور مشق جاری رکھیں۔

۵- مشق !مشق !مشق !:

یہ تقریر کی تیاری کا آخری اور سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ پہلے خیال خیال میں تقریر کو اتنا پکائیں کہ رواں ہو جائے پھر آواز کے اتار چڑھاؤ، وقف ووصل اور اعضا کی زبان (باڈی لینگویج) کا خیال رکھتے ہوئے عملی مشق شروع کر دیں۔ فن کوئی بھی ہو محنت چاہتا ہے۔ وقت کا نذرانہ مانگتا ہے۔ کسی بھی ہنر میں مہارت کرنے کے لیے دیوانہ وار محنت بہت ضروری ہے۔ جوئے شیر لانے کے لیے تیشہ بکف رہنا ہی پڑتا ہے۔ ع

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

خواہ آپ کا کتنا ہی مطالعہ کیوں نہ ہو، مشق کے بغیر تو گویا ابر ہے بارش نہیں، چمن ہے پھول نہیں، درخت ہے ثمر نہیں، چراغ ہے تیل نہیں اور کھانا ہے مگر نمک نہیں لیکن اگر آپ مطالعے کے ساتھ ساتھ مشق جاری رکھتے ہیں تو ضرور آپ کے جوہر کھلنے لگیں گے۔ ع

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

فن خطابت شعر و شاعری سے مختلف ہے۔ شاعری کے برعکس یہ فن مشق سے سیکھا جا سکتا ہے اور مسلسل محنت سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مقرر پیدائشی نہیں ہوتے۔ مستقل محنت اور مشق سے آگے بڑھتے ہیں۔ فن پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی جھولی میں نہیں گرے گا۔ پہلے آپ کو تخم ریزی کے بعد ایک خاص مدت تک اس کی حفاظت کرنی پڑے گی۔

کچھ ممتاز مقررین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں درختوں کے سامنے تقریر کرتے تھے یا بچوں کو اکٹھا کر لیتے اور ان کے سامنے تقریر کی مشق کرتے رہتے۔ آپ بھی کھلی فضا میں کہیں جا کر یا کسی بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے سامنے سامعین کا تصور باندھ

کر تقریر کی مشق نہایت عمدگی سے کر سکتے ہیں۔ صحتِ تلفظ اور حسنِ ادا کا جائزہ لینے کے لیے آپ اپنی تقریر ریکارڈ کر کے سن سکتے ہیں۔ بہت سے مقررین مشق نہ کرنے کی وجہ سے سامعین کے سامنے آکر دو چار منٹ ہی تقریر کرتے ہیں تو ان کا حافظہ، ان کا گلا اور ان کی آواز انہیں بیچ منجدھار چھوڑ کر، کنارے پر کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔



تقریر کی تیاری اور تقریر کرنے کے درمیان ایک مشکل مرحلہ آتا ہے۔ مناسب ہے کہ ہم اس کو یہیں زیرِ بحث لے آئیں اور وہ ہے اسٹیج کا خوف۔

اسٹیج کا خوف:

اسٹیج ہر مقرر کی ابتدائی آزمائش ہے۔ ہر بڑے مقرر نے اس آزمائش کا سامنا کیا ہے اور ہر نئے مقرر کو پہلے پہل اس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سے فرار ممکن ہی نہیں۔ گویا اسٹیج سب سے بڑی روک ہے جو کسی مقرر کو شروع ہی میں پیش آتی ہے۔

ہر مقرر کے حواس ابتدائی طور پر اسٹیج سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ ایک نادیدہ خوف سے گھبراتا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اپنی ذات پر اُسے اعتماد نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ عوام سے خوفزدہ ہے لیکن یہ خوف دو تین تجربوں ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ابتدائی تجربے میں ہراس پیدا کرتی ہے۔ یہ کوئی سانحہ یا افتاد نہیں، ایک قدرتی اضطراب ہے اور ہر نیا تجربہ دماغ کو اس طرح کے تذبذب میں مبتلا کرتا ہے۔ اسٹیج کا خوف بظاہر حواس کا اضطراب اور اعصاب کا تعطل ہے لیکن اس کی پیدائش ایک ایسے خوف سے ہوتی ہے جو انسانوں کے جھرمٹ سے پیدا ہوتا اور خیالات میں ہلچل ڈالتا ہے۔ ایک ایسی کیفیت اُبھر آتی ہے کہ مقرر کا وجود سیمابی ہو جاتا، اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی اور اُس کے افکار ذہن میں لٹک یا اٹک کے رہ جاتے ہیں۔ اس لمحہ محسوس ہوتا ہے کہ

اس کے حلق میں کوئی غیر مرئی ہاتھ ہے جو اس کے الفاظ کو کھینچ رہا، اُس کے فقروں کو سکیڑ رہا اور اس کی آواز کو تھرّا رہا ہے۔

اگر مقرر پہلے خوبصورت ابتدائیہ تیار کرے اور عوام اس پر تحسین کریں تو اسٹیج کا خوف ان فقروں اور نعروں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا اور مقرر احتساب کے غیر شعوری احساس سے نکل جاتا ہے۔ پھر یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ الفاظ و معانی کی نبضیں ڈوب رہی ہیں یا آواز موجِ تہہ نشین ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسٹیج کا خوف کوئی خوف ہی نہیں۔ کچھ ہے تو مقرر کی کم اعتمادی ہے۔ مقرر غیر شعوری طور پر اس کا شکار ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جو لوگ بیٹھے ہیں، وہ شاید نقاد یا محتسب ہیں۔ ان کی نگاہیں، اس کے تعاقب میں ہیں۔ اس ڈر سے کبھی اُس کی آواز کانپتی، کبھی دانت بجتے، کبھی لہجہ پھسل جاتا ہے حتیٰ کہ الفاظ گلے کی پھانس ہو جاتے اور خیالات چکنا چور ہونے لگتے ہیں۔ اس مرحلہ میں صوت اور سکوت میں آویزش ہوتی ہے۔ اِدھر آواز پر سکتہ طاری ہوتا، اُدھر تلفّظ کا سانس اُکھڑ جاتا ہے۔ اسی خوف سے کئی اضحوکے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً آواز بے ہنگم ہو جاتی ہے۔ واحد متکلّم کی جگہ جمع متکلّم اور تذکیر کی جگہ تانیث آ جاتی ہے۔ تمام اجزائے دماغ بکھر جاتے ہیں۔ پاؤں ڈگمگاتے، بدن پہ کپکپی طاری ہوتی اور چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں ...... لیکن یہ دو ایک تجربوں کی چیز ہے۔ ایک دفعہ اس پُل صراط سے ہر مقرر کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اسٹیج کا خوف ہی نہیں رہتا، پھر ایک مقرر کے لیے اسٹیج اس کی جولان گاہ اور عوام اس کی متاع ہیں اور وہ ان سے سبھی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک مقرر اسٹیج کی گھبراہٹ پر قابو پا کر محسوس کرتا ہے کہ اس کی زبان کھل گئی ہے اور اس کا دماغ ہراس سے نکل چکا ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ ماحول میں ہے۔ اس کے سامنے اس کی مرضی کا میدان ہے۔ وہ کھلی فضا میں اڑ رہا اور سامعین کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جا رہا ہے۔

اس خوف کا علاج کیسے؟

واضح رہے کہ ہر فن شروع میں مشکل ہوتا ہے۔ ہم بچے تھے، ہم نے بیٹھنا سیکھا، چلنا سیکھا، بولنا سیکھا، پڑھنا سیکھا۔ کبھی ہمارے لیے حروف ابجد کو پہنچاننا اتنا ہی مشکل تھا۔ جتنا ہمارے لیے اسرارِ فطرت کے بعض گوشوں سے آگاہی حاصل کرنا اور مابعد الطبیعاتی حقائق سے آگاہ ہونا یہ کھانا پینا اور پہننا ہمارا سیکھا ہوا ہے۔ ہر وہ چیز جو شعور کا حصہ بننے کے بعد سادہ سہل اور آسان نظر آتی ہے ہماری سیکھی ہوئی ہے اور یاد کیجیے کہ ہم نے کتنی محنت سے سیکھی ہے؟ ہر تیراک پہلے ڈوبتا رہا اور ہر سوار پہلے گرتا رہا ہے۔ یہ نوشت وخواند، یہ بول چال، یہ کہنا سننا، یہ بات چیت کیا ہیں؟ یہ سب سیکھی ہوئی ہیں۔ ان کی تحصیل کے لیے ہم کسی نہ کسی درجہ کی محنت و مشکل سے نکلے ہیں۔ یہی چیز عوام سے خطاب میں پیش آتی ہے لیکن جونہی وہ خوف ٹل جاتا ہے تو ہم حواس کے ہراس سے نکل جاتے ہیں۔ پھر جیسے وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔

جس طرح ایک بچہ شروع شروع میں کھڑا ہونے سے لرزتا ہے اسی طرح ایک مقرر پہلے پہل عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے اور اس کا علاج "تقریر کے عظیم مقصد کا استحضار" اور "اعتمادِ ذات" ہے۔

۱- مقصد کا استحضار:

یعنی آپ یہ سوچیے کہ آپ اپنی دھاک بٹھانے نہیں، بلکہ اللہ کا حکم پورا کرنے اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت میں اپنا فرض منصبی ادا کرنے جارہے ہیں۔ آپ خود کچھ بھی نہیں لیکن جس عظیم ذات کا پیغام آپ اس کے بندوں تک پہنچارہے ہیں وہ سب کچھ ہے اور لامتناہی قوتوں کی مالک ہے۔

اس تصور کے ساتھ ہی تعلق مع اللہ کا ایک احساس آپ کے دل ودماغ کو تقویت دے

گا اور آپ وساوس واوہام کے ہجوم سے آزاد ہو کر سنتِ انبیاء کو ادا کرنے کے لیے بھرپور اعتماد اور قوت قلب کے ساتھ مائیک کے سامنے جا سکیں گے۔

۲-اعتمادِ ذات:

یہ بہت اہم بات ہے کہ مقرر کو اپنی ذات پر کس قدر اعتماد ہے؟ یاد رکھیے! جب آپ یہ تصور کریں گے کہ آپ مجمع کے لیے کچھ لائے ہیں اور وہ قیمتی متاع اُسے سونپنا چاہتے ہیں تو ابتدائی خوف موجِ ہوا کی طرح نکل جائے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ جن لوگوں سے آپ مخاطب ہیں، ان سے آپ کچھ لے نہیں رہے بلکہ انہیں کچھ دے رہے ہیں اور اس غرض سے آپ کے روبرو انہوں نے سماعت کا کشکول پھیلا رکھا ہے۔ وہ سائل ہیں اور آپ فیاض وسخی۔ وہ طالب ہیں اور آپ مطلوب۔ وہ ضرورت مند ہیں اور کچھ لینے آئے ہیں۔ آپ دولت مند ہیں اور انہیں بہت کچھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ اوپر ہے ان کا نیچے اور جو اپنا ہاتھ اوپر رکھتا ہے اللہ رب العالمین کی مدد ونصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

خطیب کے لیے چند ناگزیر چیزیں

۱- مطالعہ:

خطابت کی اساس آواز پر اور آواز کی طاقت زبان سے ہے لیکن خطابت کا ہیولیٰ مطالعہ سے تشکیل پاتا ہے اور مطالعہ میں مشاہدہ و تجربہ سے تناسب پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ کے لیے کوئی خاتمہ نہیں۔ اس میں تسلسل ہے۔ جس طرح صبح و شام طلوع و غروب ہوتے اور روز و شب ازل سے ابد کی طرح رواں ہیں، اسی طرح مطالعہ ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے ہے۔ ہر زمانہ میں اس کی نوعتیں بدل جاتی ہیں لیکن اس کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ اس کے لالہ زار میں سدا بہار شگوفے کھلتے اور پھول بنتے ہیں۔

اخبار و جرائد کا مطالعہ تاریخ و سیاست کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ ان دونوں موضوعات پر کتابوں کے ڈھیر ہیں۔ چونکہ دنیا ہر لحظہ بدلتی اور انقلاب بہر عنوان آتے چلے جاتے ہیں، اس لیے تاریخ و سیاست کی جزئیات تک محفوظ کی جاتی ہیں۔ کیا چیز ہے جو حوالہ قلم نہیں ہو چکی ہے؟ مذہبیات، نفسیات، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، طبعیات، شخصیات، وغیرہ کا ہر گوشہ تحریر میں آ چکا ہے۔ ان سب کو عمومی ضرورت کے مطابق مطالعہ میں رکھیے کہ ان سب جواہر پاروں کے صدف کا نام خطابت ہے۔

مطالعہ خطیب کی غذا ہے:

ایک خطیب و مقرر کے لیے حاصلِ مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا بدن کو زندہ رکھنے کے لیے غذا اور پیاس کو مٹانے کے لیے پانی۔ ایک خطیب کے لیے مطالعہ اُس کی غذا ہے۔

اُس کا فرض ہے کہ مطالعہ اُس کا معمول ہو اور وہ جس طرح غذا اور پانی کے بغیر دن نہیں گزار سکتا۔ اس طرح مطالعہ کے بغیر یہ محسوس کرے کہ اُس کا دماغ آج بھوکا رہا ہے۔ جو مقرر یا خطیب مطالعہ سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں خواہ اس خیال سے کہ انہیں مطالعہ کی ضرورت نہیں رہی اور وہ خطابت کی معراج پر ہیں تو ممکن ہے انہیں کچھ عرصہ مطالعاتی خلا کا احساس نہ ہو لیکن وہ مطالعہ اور مشاہدہ سے دور ہوتے ہی خیالات میں ضعف کا شکار ہوتے اور اُن کی خطابت کو دیمک لگ جاتی ہے۔ محض ماضی کوئی چیز نہیں اور نہ اس طرح زندگی گزر سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کو اپنے ماضی سے محبت ہوتی ہے اور ماضی کی سرگزشت اس میں تحریک پیدا کرتی ہے لیکن خطابت حال سے جوان ہوتی اور مستقبل کو پروان چڑھاتی ہے۔

خطیب کو کیا پڑھنا چاہیے؟:

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک خطیب کو کیا پڑھنا چاہیے؟ ایک مقرر یا خطیب کو ابتدا میں سبھی کچھ پڑھنا چاہیے تا کہ اس کی معلومات کسی پہلو سے تشنہ نہ رہیں اور نہ اس سلسلہ میں کوئی سا گوشہ ادھورا رہ جائے۔ کسی بیان کے لیے تیاری کے وقت جس موضوع یا مضمون سے براہ راست اس کا سابقہ ہے، اس کا مطالعہ اسے ضرور کرنا چاہیے اور وہ اوصاف جو خطابت کو جلا دیتے ہیں۔ ان سے کسی لحظہ غافل نہ رہنا چاہیے۔

پھر جن مضامین کو زندگی میں خصوصیت حاصل ہے اور جو اس کے شب و روز سے مربوط ہو چکے ہیں ان کا مطالعہ مقرر کی بنیادی ضرورت ہے۔ مثلاً معیاری تذکروں، وقیع سوانح عمریوں اور مستند سفر ناموں کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔ ان سے معلومات حاصل ہوتیں، زبان ملتی اور بیان کھلتا ہے۔ اس کے علاوہ تجربہ و مشاہدہ میں اضافہ ہوتا ہے، اسلوب بنتا ہے اور ذوق وشوق کے راستے کھلتے ہیں۔ ایک مذہبی مقصد کے لیے دین کا ہمہ جہت مطالعہ لازم ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک سبیل ہو سکتا ہے چشمہ نہیں اور چشمہ کے بغیر مجمع کی تشنگیاں سیراب

نہیں ہوتیں۔ایک سیاسی مقرر کے لیے سیاسی ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس سے محروم رہ کر وہ چمک نہیں سکتا اور نہ اس طرح عوام میں تاثر پیدا ہوگا۔اس کے لیے معیاری رسائل اور ثقہ اخبارات کا مطالعہ لازم وملزوم ہیں۔

ہر کتاب مطالعہ کے لائق نہیں ہوتی اور نہ ہر مصنّف مصنّف ہوتا ہے۔کئی لوگ قلم سے مذاق کرتے ہیں۔اُن کے نزدیک قلم کی ابکائیاں اسلوبِ نگارش ہیں۔اسی طرح بعض ادیب وشاعر اور مصنف ومؤلف حلقہ یاراں کی بدولت شہرت پا جاتے اور "انجمن ستائش باہمی" کی بیساکھیوں کے سہارے قد آور ہوتے ہیں۔ان کے مطالعہ سے ممکن ہے کسی ذہنی عیاشی کا سروسامان ہو لیکن علم وخبر اور فکر ونظر کے باب میں کورے رہتے اور اکثر وبیشتر زبان وبیان کے رخنوں کا شکار ہوتے ہیں۔کئی دفعہ غیر معروف اہل قلم کے رشحاتِ فکر، اسلوب واظہار کی رفعت اور سوچ وبچار کی نزہت کا باعث ہوتے ہیں۔بہر حال مطالعہ کے لیے اردو اور انگریزی کے ذخائر میں کمی نہیں اور جو لوگ عربی وفارسی سے آشنا ہیں وہ ان کے خزانوں سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ جن لوگوں کو اُردو خطابت پر عبور ہے وہ عربی وفارسی ہی کے چشموں سے فیض یاب ہوئے۔

۲- نامور خطبا کا مشاہدہ:

جن نامور ہستیوں نے خطابت میں نام پیدا کیا ان کا مطالعہ ومشاہدہ ایک نوآموز مقرر اور نو وارد خطیب کو فنی کمال تک پہنچانے میں ضرور معاون ہوتا ہے۔جب تک دوسرے خطیبوں کو دیکھیں نہیں کہ وہ کیونکر بولتے ہیں اور دماغوں کو جیتنے کے لیے کس طرح الفاظ ومعانی میں آہنگ پیدا کرتے ہیں، تب تک فن خطابت کی تربیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ خطابت محض کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ اس موضوع پر کوئی سی نئی کتاب اُستاد ہوسکتی ہے۔اس بارے میں جتنا مطالعہ ضروری ہے اتنا مشاہدہ لازم ہے اور مشاہدہ

دوسرے مقرروں اور خطیبوں کے سننے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ کے بعد ہی ہم تجربہ کرسکتے ہیں۔ خطابت سیکھنے کا گُر یہ ہے کہ خطیبوں کو مجمعوں میں دیکھیں کہ وہ کیونکر خطاب کرتے ہیں؟ اس مشاہداتی سبق کے بغیر ملکۂ خطابت کا حصول ناممکن ہے۔

۳- الفاظ کا ذخیرہ:

ایک مقرر کے لیے ذخیرۂ الفاظ سب سے بڑی دولت ہے اور اس دولت کا صحیح مصرف سب سے بڑی نعمت ہے اور وہی قلم و زبان کے ذہنی اور غنی ہوتے ہیں جو اس دولت کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ مقرر کا فرض ہے کہ زبان کے رموز و حقائق سے واقف ہو اور جانتا ہو کہ الفاظ کیونکر ترتیب پاتے ہیں اور ان کی معنوی شکلیں کیا ہوتی ہیں؟ حرف صورت کی نمایندگی کرتا اور لفظ جذبات، احساسات و تصورات کا نمایندہ ہوتا ہے۔ فی الجملہ لفظ کے اجزائے ترکیبی حروف اور زبان کے اجزائے ترکیبی الفاظ ہیں۔ ایک مقرر کے لیے الفاظ، محاورے، روز مرّہ، ضرب الامثال، حکایتیں، تمثیلیں، لطیفے، مفردات، مرکبات، مترادفات و متضادات، تشبیہات و استعارات، اشارات و کنایات، ضمیریں، تذکیر و تانیث اور صرف و نحو کا مطالعہ و علم، فنی طور پر ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے کاملیت حاصل ہوتی اور زبان و بیان کی راہیں کھلتی ہیں۔ جب تک مقرر کو الفاظ کے صحیح استعمال میں قدرت حاصل نہ ہو، اس کے اظہار و اسلوب میں رونق پیدا ہوسکتی ہے اور نہ اس کی قوّتِ فکر جلا پاسکتی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک بڑی چیز جو خطابت کے فن کو جلا بخشتی ہے، وہ مترادف الفاظ کا حفظ و آشنائی ہے، یا پھر ان کے ٹھیک ٹھیک استعمال کا فن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مغربی زبانوں میں مترادف و ہم معنی الفاظ نہیں ہوتے، وہاں ہر لفظ کا مادہ جداگانہ ہوتا ہے، لیکن اُردو کا خزانہ چونکہ مختلف زبانوں کے الفاظ سے بھرپور ہے اور اُن میں تھوڑا بہت تغیر ہوچکا ہے، اس لیے اُردو میں مترادفات کا ایک ڈھیر ہے اور لغت کے ستر فیصد الفاظ مترادفات رکھتے ہیں۔ گو

ان الفاظ میں بھی ایک امتیازی خط ضرور ہوتا ہے جو ذوق کی نفاست اور طبیعت کی نزاکت فوراً بھانپ لیتی ہے لیکن بہر حال ہم معنی الفاظ کی بہتات اُردو کا ایک ایسا حُسن ہے کہ زبان وبیان کے ہر معرکہ میں اس سے کام لیا جاتا اور اسلوب واظہار کے مختلف پیرائے اس سے روشن کیے جاتے ہیں۔

ایک مقرر وخطیب کے لیے مترادفات (ہم معنی الفاظ) کی طرح متضادات، شعلہ نوائی کا ایندھن ہیں۔ چند الفاظ ملاحظہ فرمائیے: اچھابُرا، حُسن وقبح، خیر وشر، بہتر وبدتر۔ آپ نے معنوی تفاوت کی باریکی اور حسن ملاحظہ فرمایا۔ یہی باریکی ان کی معنویت کے یکساں خطوط کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتی ہے اور ایک خطیب وادیب ان کے معنوی استعمال ہی سے منفرد وممتاز ہوتا ہے۔ کسی پیرے یا فقرے میں مترادف ومتضاد الفاظ کا حسنِ استعمال ہی فصاحت وبلاغت کی اصل ہے۔ جس مقرر کو ان الفاظ کے استعمال پر قدرت ہوگی، اُس کا دلوں میں اُتر جانا یقینی ہے اور وہ عوام سے مخاطب ہوسکتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیسے؟:

الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے سے بڑھتا ہے۔ جس موضوع پر کتاب پڑھیے، وہ اگر بعض اعتبارات سے نئی ہے تو اچھوتے فقروں اور شگفتہ خیالوں ہی کو نوٹ نہ کیجیے بلکہ نئے لفظوں کو بھی معانی سمیت نوٹ کیجیے۔ پھر انہیں ذہن میں دہراتے رہیے۔ اس طرح آپ کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھے گا اور کچھ عرصہ بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے اظہار کی طاقت بڑھ گئی ہے حتیٰ کہ ایک دن یہی چیز آپ کے لیے گنج بے بہا ہو جائے گی۔ اسی طرح بعض نامور مقرروں کو ضرور سُنیے، ان کی تقریروں سے کئی چیزیں حاصل ہوں گی۔ نئے الفاظ کے تلفّظ کی صحت، فقروں کی ترکیب، خیالات کی رنگا رنگی، استدلال کے زاویے اور مطالب ومعانی کے خفی وجلی پہلو، اس کے علاوہ اشارات وحرکات کا مدوجزر معلوم ہوگا اور اظہار

واسلوب سے آشنائی ہوگی کہ وہ کون سی چیز ہے جو ایک خطیب کے لیے عوام میں تجسس اور مقصد کے لیے جذبہ پیدا کرتی ہے۔

دوسری چیز جو مقرر کے لیے ضروری ہے، وہ شعرا کے کلام کا مطالعہ ہے۔ شاعرانہ کلام کو سنیے بھی اور پڑھیے بھی۔ اس سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ شاعری سے سلاست پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ کے استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ مترادفات ہاتھ آتے، بیان میں زور اُبھرتا، اور تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ شاعرانہ کلام کے مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعری کے ذوق وشوق سے خطیب کے بیان میں دلکشی اور دلفریبی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھے انشا پردازوں کا مطالعہ علم ولغت کی توسیع کے علاوہ بیان اور اُس کی تاثیر میں ندرت واعجاز کا سبب ہوتا ہے۔

٤۔ خطیب کی سیرت:

خطابت کی اصل بنیاد خطیب کی سیرت ہے۔ اگر خطیب کے دامن پر کوئی دھبہ ہے یا وہ اخلاق کی ابدی قدروں میں سے کسی ایک قدر سے محروم ہے تو وہ معزز شخصیت نہیں ہوسکتا اور ایک خطیب کے لیے عزت مندی ہی قبولِ عامہ کی اساس ہے۔ اس اعتبار سے خطابت ایک خاردار وادی ہے جس سے صحت مند قدم ہی گزر سکتے ہیں۔ اکثر شاعر لہوولعب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں دو چار شاعروں کو چھوڑ کر اکثر شاعروں نے عیاشانہ زندگی بسر کی اور بعض نے اُس پر فخر کیا لیکن عوام نے کبھی اُن سے تعرض نہیں کیا۔ اسی طرح مصوّر وموسیقار اور ادیب وفنکار انہی راستوں کے مسافر رہے ہیں۔ انہوں نے معصیت کے لمحوں کو اپنی کلاہ افتخار میں ٹانکا ہے لیکن خطیب یا مقرر کسی معصیت یا گناہ کا تصور بھی کریں اور ان کا ذائقہ چکھنا چاہیں اور وہ عوام کے علم میں ہو تو وہ عوام میں ایک آدھ پھیرا ڈال سکتے ہیں لیکن عوام میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ان کی شخصیت کا ابھرنا خارج از امکان اور قبولِ عامہ کا

حصول ناممکن ہے۔ خطیب کی سیرت اُس کی دولت اور اُس کا کیریکٹر اُس کی پونجی ہے۔ جو خطبا اور مقرر اس سے محروم ہوئے وہ دماغوں اور دلوں پر کوئی نقش نہیں جما سکے۔ اُن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ اُس خوش آواز گداگر کی ہوتی ہے جو مکانوں کی چوکھٹ پر صدا دیتا اور ناکام لوٹتا ہے۔ یا پھر وہ اس ڈھولک کی تھاپ ہے جو رات کی چمک دمک گزارنے کے بعد تماشائی کے لیے منتشر و مضمحل صبح لے کر طلوع ہوتی ہے۔ خطابت بدن ہے تو سیرت اس کی رُوح ہے۔ خوبصورت رُوح ہی تندرست بدن قائم رکھتی ہے۔ کردار کی کمزوری کسی فن میں اس شدّت سے معیوب نہیں ہوتی جس شدّت سے خطابت میں اس کی پرکھ ہوتی ہے اور ایک خطیب کے اعمال پر عوام کی نگاہ رہتی ہے۔ اگر کوئی خطیب یا مقرر باعزت زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ بے داغ کردار رکھتا ہو اور اُس کی سیرت لہو ولعب کے چھینٹوں سے محفوظ ہو۔ ایک خطیب اپنے لیے یہ کُلیہ قائم نہیں کر سکتا کہ عوام کی زندگی اور نجی زندگی میں فرق ہے۔

ایک خطیب میں ذیل کے اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے امتزاج ہی سے اُس کی شخصیت استوار ہوتی ہے۔

۱۔ بے ریا کردار
۲۔ بلند نصب العین
۳۔ خلوص و وفا
٤۔ صداقت شعاری
۵۔ شخصی وجاہت
٦۔ باخبر ذہن
۷۔ نستعلیق اشارات
۸۔ طلاقت لسانی
۹۔ بے عیب آواز
۱۰۔ صحیح تلفظ
۱۱۔ حاضر جوابی
۱۲۔ برجستہ گوئی
۱۳۔ موقع شناسی
١٤۔ وحدت مقصد

۱۵-ہمدردی و پامردی
۱۶-مجمع کی نفسیات سے آگاہی
۱۷-فہم عامہ ومہارت تامہ
۱۸-مطالعہ کا شوق
۱۹-مشاہدہ کی لگن
۲۰-ابلاغ کی دُھن

یہ سب اوصاف کوئی نصاب نہیں کہ علیحدہ علیحدہ مضامین کے طور پر ان کی الگ الگ تعلیم حاصل کی جائے۔ یہ تمام اوصاف ایک پرخلوص اور پرعزم مقرر میں خلوص دل کے ساتھ فریضۂ دعوت ادا کرنے کے لیے محنت وکوشش کرنے سے خود بخود رچ بس جاتے ہیں۔ کچھ اوصاف وہبی ہوتے ہیں کچھ اکتسابی، ان دونوں کی یکجائی سے خطیب ومقرر تیار ہوتے ہیں اوران کا ایک جیتا جاگتا پیکر بن جاتا ہے۔اس سلسلہ میں ایک دماغی ارادہ اور ایک قلبی شغف راہنما ہوتا ہے۔جب ایک انسان اپنے ملکۂ وہبی کی تحریک پرخطیب بننے کا عزم کرتا ہےتو یہ اوصاف اس میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح ایک ہی لحظہ میں رنگا رنگ جلوے نگاہوں سے گزرتے اوراپنی رنگینی کا اثر پیدا کرتے ہیں۔

تقریر کے لوازم

۱- زبان و بیان:

سب سے پہلی چیز جو مقرر کے لیے خطابت کی روح ہے اور جس سے اُس کا جسم نمو پاتا ہے وہ زبان ہے۔ ایک خطیب و مقرر کے لیے زبان کا حصول اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندگی کے لیے سانس لینا۔ جب تک زبان کے نشیب و فراز سے مقرر و خطیب آگاہ نہ ہوں اور اس کے قواعد و ضوابط ان کے ذہنوں میں نقش نہ ہوں، وہ اظہار و اسلوب کی نزاکتوں اور آواز و تلفظ کی خوبیوں سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ان کے حصول کے بغیر مطالعہ، مشاہدہ اور استعداد سب بیکار ہیں۔ ایک مقرر کے لیے زبان کو بطور زبان جاننا ضروری ہے۔ پہلے زبان، پھر موضوع۔ جس طرح موضوع کے بغیر زبان محض صدا ہے، اسی طرح زبان کے لیے موضوع کوئی چیز نہیں۔ دونوں میں رُوح و بدن کا رشتہ ہے۔ رُوح بدن چاہتی اور بدن رُوح چاہتا ہے۔ اُردو خطابت میں کمال حاصل کرنے کے لیے زبان کا بحیثیت زبان حصول و مطالعہ ضروری ہے۔ جب تک زبان کی وسعتوں اور ضابطوں سے آگاہ نہ ہوں، ہم اپنی زبان میں وہ قدرت پیدا نہیں کر سکتے جس سے زبان میں سلاست کا اعجاز پیدا ہوتا ہے۔ مقصود یہ نہیں کہ آپ لغوی ہو جائیں لیکن لغت سے محروم ہونا خوبی نہیں۔ قواعدِ زبان سے آشنائی ایک طاقت ہے۔ آپ صرفی و نحوی نہ ہوں لیکن صرف و نحو سے غفلت نہ برتیں۔ زبان اس طرح سیکھی جاتی ہے کہ آپ کی محفلیں شائستہ ہوں۔ آپ کے احباب ادبی ہوں۔ آپ مستند ادیبوں، ثقہ شاعروں اور جید عالموں کے نشریے سُنیں۔ آپ ان کتابوں پہ نگاہ رکھیں جو زبان سکھاتی ہیں اور ایسی کتابیں کچھ زیادہ نہیں جن سے زبان کے

آداب معلوم ہو سکتے ہیں۔

۲- صحتِ تلفظ:

زبان ایک آلہ اظہار ہے جس سے انسان اپنے مافی الضمیر کو اور اپنے خیالات و احساسات کو بذریعہ الفاظ ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔انسانی ذہن ایک گہری جھیل ہے جس میں غم والم، رنج وراحت، الفت وکلفت، اندوہ ومسرت، عشق ومحبت، شادی وغمی، تعجب وانبساط، تحسین وستائش، آفرین ونفرین وغیرہ کے احساسات کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ان لہروں کی ترجمانی الفاظ کے ذریعے سے ہی زبان کرتی ہے اسی لیے دانشور کہتے ہیں کہ الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔آوازیں تو اصطبلوں اور باڑوں میں بھی بہت ہوتی ہیں، لیکن ان میں اور انسانی نطق میں فرق تلفظ کے ذریعے ہوتا ہے، پھر عام انسانوں اور تعلیم کے ذریعے تہذیب پا جانے والے انسانوں میں حد فاصل تلفظ کی صحت اور حسنِ ادا کے ذریعے کھچتی ہے۔اس لیے خطبا کے لیے بالعموم اور تقریری مقابلوں میں شرکت کرنے والوں کے لیے بالخصوص صحت تلفظ کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ع

بندشِ الفاظ جَڑنے سے نگوں کے کم نہیں

(آتش)

شیر گونجتا ہے، ہاتھی چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، چڑیاں چہچہاتی ہیں، سانپ پھنکارتا ہے، انسان کے جذبات بھی بسا اوقات حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں، مگر اس کے پاس جانوروں سے بڑھ کر ایک قوت ہے یعنی نطق وگویائی، اس لیے جب اس پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔اب الفاظ جتنے سادہ و شیریں ہوں گے، بندش صاف ہوگی اور طرز ادا میں جدت ہوگی، جذبات کا اظہار اتنا ہی مؤثر ہوگا۔یہ الفاظ ہی ہیں جن کے جال بچھا کر مقرر سامعین کو جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

سامعین اس کے جھوٹے سچے لفظوں کی بارش میں بھیگتے چلے جاتے ہیں۔

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں: بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پرشوکت، متین اور بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق ومحبت کے مضامین ادا کرنے کے لیے موزوں ہیں۔ عشق ومحبت انسان کے لطیف ونازک جذبات ہیں اس لیے ان کے ادا کرنے کے لیے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہییں۔ بلند اور پرشوکت الفاظ رزمیہ مضامین اور شخصیات وقصائد وغیرہ کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقررین کو صحت تلفظ کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا ذخیرۂ الفاظ بھی بڑھانا چاہیے تاکہ انہیں کسی مقام پر اس طرح کے عجزِ بیان کا شکار نہ ہونا پڑے کہ ؎

جو سوچتا ہوں وہی تجھ سے کہہ نہیں سکتا
میرے خیال کی قوت میری زباں میں نہیں

۳- آواز کا اتار چڑھاؤ:

جس طرح بیٹھنے، لیٹنے، کھڑے رہنے اور چلنے کے انداز میں تنوع اور تبدیلی خوشگوار ہوتی ہے اور ہم دیر تک کسی ایک ہی حالت میں نہیں رہ سکتے، اسی طرح آواز میں بھی موضوع اور ذہنی کیفیت کے اعتبار سے تبدیلی ہونی چاہیے۔ آواز پر قدرت حاصل کرنا بڑا فن ہے۔

ہمیں چیخ کی طرح تیز اور دھیمی آواز دونوں سے بچنا چاہئے اور موضوع اور موقع محل کی مناسبت سے آواز میں تغیر پیدا کرتے رہنا چاہیے۔

وہ مصور جو محض ایک ہی رنگ کا استعمال کرتا ہے، وہ بھی موقع محل کی مناسبت سے گہرا اور ہلکا رنگ دے کر تنوع پیدا کر دیتا ہے۔

غیر تربیت یافتہ مقررین اپنے لیے ایک خاص سُر چن لیتے ہیں۔ اور اگر تنوع پیدا بھی کرتے ہیں تو مجمع کی کثرت یا مقام کی وسعت کی مناسبت سے دھیما بولتے یا زیادہ چیخنے لگتے

ہیں، حالانکہ تقریر کا سنا جانا آواز کی بلندی پر نہیں بلکہ اسکی وضاحت پر منحصر ہے۔ یاد رکھیے! ترنم تو وہبی چیز ہے اور اس کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں، لیکن آواز کا متناسب اتار چڑھاؤ کسبی چیز ہے۔ ذرا سی توجہ سے سیکھی جاسکتی ہے اور اس کے نہ ہونے سے تقریر بے ہنگم چیخم دھاڑ میں تبدیل ہونے کے خطرے سے دوچار رہتی ہے۔ بعض مقرر کمزور اور پست آواز میں الفاظ کو ادا کرتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ جو وہ کہتے ہیں اسے خود بھی نہیں سمجھتے اور نہ دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

آواز میں حسب منشا تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آواز کے اتار چڑھاؤ کی مشق کی جائے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی عبارت لے کر پہلے اس کا مطالعہ کیا جائے پھر درج ذیل امور کا لحاظ رکھتے ہوئے زیرِ لب پڑھا جائے۔ بعد ازاں تیسرے مرحلے میں بلند آواز سے اس کی خواندگی کی جائے۔ وہ امور یہ ہیں:

۱- صحیح اور درست تلفظ

۲- موزوں اور عمدہ لب ولہجہ

۳- صحیح مقام پر سانس توڑنا (کبھی سانس مکمل توڑ دیا جاتا ہے اور کبھی لمحہ بھر کو)

٤- ہلکے پھلکے جملوں پر اتار اور دھیمے پن جبکہ زوردار جملوں پر چڑھاؤ یا گونج وگرج کا اہتمام۔

اپنا لہجہ بھی درست کیجیے:

آواز کی مخصوص فطری کیفیت کا نام لہجہ ہے، جو ہر شخص کا مختلف ہوتا ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے بغیر الفاظ میں معنی پیدا نہیں ہوتے لہٰذا مقرر کو لہجے کے انتخاب میں نہایت ہوش مندی سے کام لینا چاہیے۔

سانس لینے کی صحیح مشق بھی مقرر کے لیے ناگزیر ہے۔ گردن کو تان کر اور سیدھے کھڑے ہو کر اس طرح سانس لینا کہ سینہ پھول جائے اور پھر آہستہ آہستہ سانس نکالنا بہت

مفید مشق ہے۔اس طرح کرنے سے سانس پر اس حد تک کنٹرول ہو جاتا ہے کہ وہ وعظ کے دوران واعظ کی آواز اور رفتار کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

اتار چڑھاؤ کا تجربہ کیسے؟:

یہ تجربہ مختلف مقرروں کی تقریریں سننے سے حاصل ہوتا ہے کہ الفاظ کا زیر و بم کیا ہے؟ کس خیال کے ساتھ کون سا لفظ کس رنگ اور ترنگ سے بولا جاتا ہے؟ کہاں آواز اٹھائی جاتی ہے اور کہاں اسے دھیما کیا جاتا ہے؟

بعض لوگ اس خیال سے گلا پھاڑتے ہیں کہ شاید تقریر کا لہجہ یہی ہو۔بعض گونج اور گرج کو زبان و بیان کا حسن سمجھتے ہیں، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی چیز ہر لفظ اور ہر جملے کے ساتھ نہیں جچتی۔ یہ صحیح ہے کہ تقریر میں گونج اور گرج سے کام لیا جاتا ہے لیکن کس موڑ پر یا کس مرحلہ میں؟ یہ جاننا بہت ضروری ہے۔خطابت کی اصل جان سلاست اور ملائمت ہے لیکن ملائمت سے مراد خنکی یا آہستگی نہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مٹھاس سے کہہ رہے ہیں۔ وہ شور و غل نہیں، آواز کا مدو جزر ہے۔تجربہ کار اور کہنہ مشق خطبا کی تقاریر کو کان لگا کر غور سے سنیں اور نوٹ کریں کہ وہ آواز کی بلندی و پستی کو الفاظ کی ادائیگی سے کیسے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ آپ کی آواز میں رچاؤ اور صوتی تاثرات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔

٤- سلاست:

سلاست معناً نصف خطابت ہے۔اس کے معنی نہ تو الفاظ کی بوچھاڑ کے ہیں اور نہ صوتی گونج گرج کے۔سلاست کے معنی ہیں روانی، لیکن روانی کے معنی نہ تو لب ولہجہ کی سیلابی وطغیانی کیفیت کے ہیں اور نہ صوتی آبشار یا آواز کی تیغ زنی کے۔اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ کہنا ہے بغیر کسی اٹکاؤ کے کہیں اور الفاظ اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو کر نکلیں جس طرح ہار میں پروئے ہوئے موتی یا پھر عروسی جوڑا جو گوٹا کناری کی تزئین سے مرصّع ہوتا ہے۔

جس طرح ایک متناسب الاعضا جسم کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا ہے اسی طرح سلاست کے باعث ایک جامع تقریر اس طرح کھلتی چلی جاتی ہے کہ اُس کے جُملے دل میں ترازو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سلاست کیونکر پیدا ہو؟

یہ سوال کہ سلاست کیوں کر پیدا ہو؟ تو یہ مشکل نہیں۔ آپ کی آواز بے عیب ہے اس میں کوئی نقص نہیں تو زبان کی لہروں پر قابو پایئے، خزانۂ الفاظ بڑھاتے رہیے، افکار و مطالب کو وسیع کرتے جایئے اور تلفظ کی صحت کے ساتھ بول چال کا ملکہ پیدا کیجیے۔ نتیجتاً سلاست بڑھے گی، قوت متخیلہ کو راہ ملے گی اور اظہار و بیان میں صحت و توازن پیدا ہوں گے۔ دراصل روانی سے مراد ہے اظہار خیال کے وقت زبان سے مناسب الفاظ کا بے تکلف ادا ہونا اور یہ صفت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہمارے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ موجود ہو اور ہم ان کے بے تکلف استعمال پر قادر ہوں۔ خطابت کی کامیابی کے لیے یہ بڑی ضروری اور اصولی شرط ہے، کیونکہ خیالات کو روانی و تسلسل کے ساتھ ظاہر کرنا لوگوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

وہ مقرر رجو رک رک کر تقریر کرتا ہو اس کے متعلق یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس یا تو کوئی معقول بات کہنے کو نہیں یا یہ کہ مناسب الفاظ کی کمی ہے اور ان دونوں باتوں سے لوگوں کی توجہ مقرر کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔

سہولت اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے مطلب کو ادا کر سکنا الفاظ کے مسلسل استعمال ہی کا نتیجہ ہے۔ جوں جوں الفاظ کے استعمال پر قدرت بڑھتی جائے گی تقریر میں بھی سہولت اور بے ساختگی پیدا ہوتی جائے گی۔

الفاظ کا بے تکلف استعمال کلیتاً مشق پر منحصر ہے اور یہ بات مسلسل مشق سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

تقریر کی خوبیاں

۱-فصاحت و بلاغت:

بلاغت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں موقع کے مطابق برمحل اور واضح گفتگو۔ بلاغت تقریر کی جان ہوتی ہے۔ تقاریر کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ تقریر کو مبہم قسم کی تبلیغ نہ بننے دیں۔ ہمیشہ تقاضائے حال کے مطابق صاف اور واضح گفتگو کریں جو دل سے نکلے اور دل میں اُتر جائے۔ جو مقررین اپنے سامعین کی تعلیم، عمر اور قابلیت وغیرہ کو ذہن میں رکھ کر بات نہیں کرتے، ناکام ہوتے ہیں۔ تقریر کو کبھی بھی "معمّٰی اور پہیلی" نہ بنایا جائے۔ مولانا جوہر نے کیا خوب بات کہی ہے۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سامعین کو الزام دینے سے کہیں اچھا ہے کہ بلاغت کو بہتر بنایا جائے۔ اچھا مقرر کبھی بھی نامناسب و ناموزوں الفاظ کے بھاری پتھر مار کر سامعین کے لیے فہم کے جال نہیں بچھاتا۔ یہ ضروری بھی ہے۔ ابلاغ کے عمل کے بغیر محض اظہارِ بیاں سے بات نہیں بنتی۔ یعنی اگر مقرر پر جو کچھ بیت رہی ہے وہ اسے لوگوں تک منتقل ہی نہ کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اظہار تو ہو گیا لیکن بلاغت کا مرحلہ طے نہیں ہوا۔ تقریر میں جہاں اس طرح کی بات کی جائے جس کے معانی سامعین کو جوتشیوں اور نجومیوں سے پوچھنا پڑیں وہاں ابلاغ کا کیا کام؟ اور جہاں ابلاغ کا عمل نہیں وہاں مقبولیت اور کامیابی کا کیا سوال؟

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف " نہایۃ الا یجاز فی درایۃ

الاعجاز" میں بلاغت کی تعریف یوں کی ہے: "بلاغت یہ ہے کہ آدمی عبارت کے ذریعے اس باریکی تک پہنچ جائے جو اس کے دل میں ہو اور اس کے ساتھ ہی خلجان پیدا کرنے والے اختصار اور اکتاہٹ پیدا کرنے والی طوالت سے عبارت کو بچائے اور فصاحت یہ ہے کہ عبارت، تعقید (الفاظ کا اپنے اصل مقام سے آگے پیچھے ہو جانا) سے خالی ہو۔"

فصاحت الفاظ میں بھی ہوتی ہے اور کلام میں بھی۔ الفاظ کی فصاحت یہ ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس و ناموزوں نہ ہوں۔ کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت ہیئت وغیرہ کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ تنافر اور تعقید سے پاک ہو۔

فصاحت و بلاغت ایک اعتبار سے جڑواں اوصاف ہیں۔ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہوسکتا جب تک کہ فصیح نہ ہو اور اس وقت تک فصیح نہیں کہلاسکتا جب تک بلیغ نہ ہو۔

اردو زبان میں فصاحت و بلاغت کا معیار جداگانہ ہے۔ یہاں دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کے اصول بھی علیحدہ ہیں۔ جب تک کوئی ان اصولوں پر نظر نہ رکھے وہ اردو کی مزاج شناسی اور اسے صحیح طور پر برتنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص فارسی کے الفاظ "دست، گل، چشم، خانہ، مے "کو ان کے معنی کا خیال رکھ کر اردو میں یوں بولے یا لکھے کہ:

۱-اس نے مصافحہ کے لیے دست بڑھایا۔

۲-یہ گل بہت اچھا ہے۔

۳-میری چشم میں درد ہے۔

٤-وہ اپنے خانہ کو گیا۔

۵- وہ مے بہت پیتا ہے۔

تو استعمال درست نہ ہوگا۔قواعد کی رو سے یہ جملے درست ہیں لیکن اردو کے روزمرہ کے لحاظ سے غلط ہیں۔ یہ الفاظ الگ الگ فصیح و بلیغ سہی لیکن یہاں یہ الفاظ عبارت میں فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کے بجائے ایک قسم کا بھونڈا پن اور مضحکہ خیز پہلو پیدا کر رہے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اردو میں عربی و فارسی کے مفرد الفاظ کا استعمال اول تو بہت کم ہوتا ہے دوسرے ان الفاظ کا استعمال اسی وقت حسن و زور و فصاحت میں مدد دیتا ہے جبکہ انہیں فارسی ترکیب یا مرکب بنا کر استعمال کیا جائے، مثلاً: دست درازی، گلِ پیراہن، آشوبِ چشم، خانہ بدوش، مے نوش اور مے خانہ وغیرہ ؎

آپ تحریر تو پڑھتے ہیں یہ جانچا کیجیے
کس قدر بے ربط جملے ہیں ہر اک تحریر میں
آپ تقریر تو سنتے ہیں یہ دیکھا کیجیے
فالتو الفاظ کتنے ہیں ہر اک تقریر میں

۲-اسلوبِ بیان:

جس طرح ہر لکھنے والے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے، مثلاً ابوالکلام آزاد بڑی پیچیدہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، اطناب سے کام لیتے ہیں، مغلق الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی ایک صفت ایسی ہے کہ اس تمام طمطراق کے باوجود اور خندہ آور تصنع کے باوصف ان کو مستحق احترام بنادیتی ہے اور تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ہے ان کے لکھنے کا اسلوب جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے ؎

یارو! سرِ ورق پر میرا نام مت لکھو
تحریر بولتی ہے کہ تحریر کس کی ہے؟

بالکل اسی طرح اسلوبِ بیاں کسی بھی مقرر کی وہ انفرادیت ہے جو اسے دوسرے مقررین سے الگ کرتی ہے۔ اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہئیت وصورت کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اکثر ماہرین کے مطابق اسلوبِ بیان مواد سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایک اچھا اسلوبِ بیان کمتر مواد کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیتا ہے۔ مدارس و جامعات کے مقابلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمیشہ بہترین مواد والے مقررین انعام نہیں پاتے بلکہ جو مقرر معیاری مواد کو ترتیب دے کر اچھے اسلوب سے پیش کرتا ہے، میدان اکثر اسی کے ہاتھ رہتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح جیسے سید امین گیلانی کوئی بھی نظم سنائیں اچھی لگتی ہے ؎

رودادِ چمن دونوں سناتے تو ہیں لیکن
کانٹوں کا بیاں اور ہے پھولوں کا بیاں اور

"حسنِ ادا" اسی کا نام ہے۔ کہنے کو یہ دو لفظ ہیں اور آدھی سی بات مگر حق یہ ہے کہ 'ادا' نہیں تو "حسن" بھی کچھ نہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب عام خطبا کا لب ولہجہ چند رٹی رٹائی حکایات ہیں۔ کچھ منتخب لطائف ہیں۔ مخالفین پر ننگی تنقید اور واضح دشنام طرازی ہے۔ موضوع میں ربط ہے نہ تقریر میں تسلسل۔ یکسانیت ہے نہ ہم آہنگی اور تعجب اس پر ہے کہ ایسے مقررین کو سن سن کر عوام کا مزاج بھی بگڑ گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ واضح انداز میں مدلل اور معقول بات کی جائے۔ کسی اور کی چھاپ نہ ہو۔ ہر خاص و عام متاثر ہو۔ لہجہ پرسوز ہو کہ قلب و دماغ کی کایا پلٹ جائے۔ انداز ایسا معتدل ہو کہ خواہ مخواہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ عام طور پر جذباتی تقاریر جب احاطۂ تحریر میں لائی جاتی ہیں تو وہ بہت معمولی لگتی ہیں۔ کسی واقعہ یا حادثہ کی نسبت کی ہوئی دھواں دھار تقریر پر جب وقت کی گرد پڑ جاتی ہے تو اسے پڑھنے والا اس لمحے سے بہت دور ہو چکا ہوتا ہے جو سامعین کو میسر تھا تو ایسی تقریر بجھی بجھی اور پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔ بجھی آگ کے تکلیف دہ دھوئیں سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتی۔اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قارئین کے سامنے وہ واقعہ رونما نہیں ہوا ہوتا کہ وہ اس کی شدت کا اندازہ کر سکیں اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ مقرر کی ذات، صفات، اس کا انداز، آہنگ اور لب ولہجہ وہ چیزیں ہیں جو سامعین میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہیں اور تحریر میں ان کی غیر موجودگی سے جو کمی واقع ہو جاتی ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے، البتہ وہ چند تقاریر جو اس اصول سے مستثنٰی ہوں انہیں کلاسیک کا درجہ مل جاتا ہے۔ عام طور پر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مقرر بہت اعلیٰ پائے کا انشا پرداز بھی ہو۔اس کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ان کے کہے ہوئے الفاظ آج بھی وہی تاثر اپنے اندر لیے ہوئے ہیں جو اس زمانہ میں ان کا خاصہ رہا ہوگا ؎

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

۳۔شعری چاشنی:

مقابلے کی تقاریر میں کامیابی کے لیے شعریت بہت ضروری ہے۔نگینے کی طرح جڑے ہوئے خوبصورت فقرات اور اشعار تقریر کے حسن میں نکھار پیدا کر دیتے ہیں۔ برمحل اشعار جن کا اصل مضمون سے گہرا تعلق ہو، تقریر کو سحر آفریں بنا دیتے ہیں ؎

لطف بڑھ جاتا ہے اقبال شعر گوئی کا
شعر نکلے جو صدفِ دل سے گُہر کی صورت

انسان فطرتاً شعر و شاعری کو پسند کرتا ہے۔وہ عالم نشاط و انبساط میں زیر لب شعر پڑھتا ہے۔تقریر میں برمحل اور بامعنی شعر وہ حسن پیدا کرتا ہے جو مناسب جگہ پر ٹانکا گیا خوبصورت موتی۔شرط یہ ہے کہ آپ کو مناسب جگہ ٹانکنے کا گُر آتا ہو۔اس سلسلہ میں ایک بات کا خیال رہے کہ کسی شعر کا بہت زیادہ استعمال بھی مقرر کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔اسی طرح بعض ایسے

اشعار ہوتے ہیں کہ باوجود بہت لاجواب ہونے کے زبان زدِ ہر خاص و عام ہو کر اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں، مثلاً ؎

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو!
نجانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

یا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یا

آ ستم گر ہنر آزمائیں　　تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

یہ بلاشبہ لافانی اشعار ہیں مگر مقابلے کی تقاریر میں ایسے اشعار سے ہرگز کام نہیں چلتا۔ اشعار کے بارے میں ایک یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ آپ تقریر میں ایسے مناسب اشعار استعمال کریں جن کے بارے میں آپ کو اطمینان ہو کہ دیگر مقررین ان اشعار کو استعمال نہیں کریں گے، اس لیے کہ تتلیاں بھی اتنا احساس رکھتی ہیں کہ وہ ہمیشہ شگفتہ اور تر و تازہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔

طالب علم مقررین کے لیے ضروری ہے کہ اگر کسی تقریری مقابلہ کے دوران ان سے پہلے تقریر کرنے والے مقرر نے کوئی ایسا شعر پڑھا ہے جو ان کی تقریر میں شامل ہے تو کوشش کریں کہ فوراً اس شعر کو کسی دوسرے مناسب شعر سے بدل دیں۔ کائی جمے ہوئے حوض کی تہہ سے برآمد ہونے والے ازکار رفتہ سکے آپ کے کام نہ آئیں گے۔ بہر حال یہ وسعت مطالعہ کی بات ہے۔

٤- لہجے کی مٹھاس:

یہ صحیح ہے کہ خطابت کا ملکہ وہبی ہوتا ہے لیکن ایک ایسا شخص ذوق و شوق اور محنت

وریاضت سے بہت جلد اپنے اندر ایک مقرر کی خوبیاں پیدا کرسکتا ہے جو چند اوصاف کو اپنالے۔ ان میں سے مثلاً ایک چیز لہجے کی مٹھاس ہے۔ عادت بنا لیجیے کہ آپ زیرِ مطالعہ کتاب کے چند صفحے مطالعہ کی خلوت میں تیزی اور شیرینی سے پڑھیں۔ ممکن ہے شیرینی کا لفظ بے محل ہو۔ اس سے مراد لہجہ کی مٹھاس ہے۔ الفاظ کو آوارہ دھنوں کی طرح پھینکنا یا اس قسم کا تاثر دینا کہ الفاظ قے کیے جارہے ہیں، بنیادی طور پر غلط ہے۔ ان میں مضراب کے تاروں کی سی ہم آہنگی پیدا کرنا ہی اُن کا حُسن ہے کہ اس حسن ہی سے نغمہ پیدا ہوتا اور وجدان لطف اُٹھاتا ہے اور یہی چیز سامع کے ذہن کو خطیب کی گفتار کے ساتھ یوں ہم آہنگ کرتی ہے کہ وہ سامع کو جہاں لے جانا چاہے بلا توقف چلتا جاتا ہے۔ الغرض مطالعہ وآواز کی ان کیفیتوں کے اظہار و اسلوب کے سانچہ میں ڈھلنے کا نام سلاست ہے۔ اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ لہجہ کا متوازن رہنا، آواز کا بے قابو نہ ہونا اور زبان کا تسلسل سے چلنا، مٹھاس کی اساس ہے۔ اس کو الفاظ کے سنگھار، افکار کے نکھار اور مطالعہ کی بہار سے جلا ملتی ہے۔

۵- بشاشتِ طبع:

طبیعت کُھلی ہو تو خیالات خود بخود اُمڈتے چلے آتے ہیں اور سلاست میں بادِ صبا کا خرام آجاتا ہے۔ طبیعت منغّض ہو تو دماغ معطل اور دل منقبض ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں سلاست منجمد ہوجاتی ہے۔ سامعین قہقہے پھینکتے یا جمائیاں لینے لگتے ہیں۔ یہ حال ہو تو مقرر کا تقریر کرنے سے تقریر نہ کرنا بہتر ہے، کیونکہ تقریر الفاظ کا ڈنٹر پیلنے کا نام نہیں اور نہ لہجہ کی تھکاوٹ خطابت کے لیے سازگار ہے۔ تقریر کے لیے پہلی چیز مقرر کی بشاشت ہے اور بشاشت کا مطلب ہے دماغ و دل کی طراوت۔ ایک مسرور و مطمئن مقرر ہی عوام سے خطاب کرنے کا حوصلہ کرسکتا اور اس پر قادر ہوتا ہے۔ جس مقرر کی طبیعت شگفتہ نہ ہو اور اُس نے

اپنے وجود پر ایک مصنوعی سنجیدگی طاری کر رکھی ہو، وہ عوام سے مخاطبت کے باوجود نہ تو خطابت کی رنگارنگی قائم کر سکتا ہے اور نہ آواز و بیان سے تاثر پیدا کر سکتا ہے۔

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۹٤٦ء میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں، ایک چوتھائی جیل میں۔ جتنے دن باہر رہا، لوگ گلے کا ہار بنتے گئے۔ آج کلکتہ، کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی پھر آگرہ، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کرلو، ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔ دن کہیں، صبح کہیں، رات کہیں۔ میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا: "واہ شاہ جی واہ!" میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا: "آہ شاہ جی آہ"۔ اور تمہاری اس آہ اور واہ میں ہم ہو گئے تباہ......."۔

٦-خیالات کی سچائی:

خطابت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مقرر سے لے کر تقریر تک سب کچھ غیر مصنوعی ہو۔ کسی پہلو سے کوئی چیز مصنوعی ہوگی تو لازماً بھونڈی ہوگی۔ کسی عوامی جلسہ میں عوام تماشا دیکھنے کے لیے نہیں، کچھ پانے کے لیے آتے ہیں اور ہمیشہ اخلاص سے مسخر ہوتے ہیں۔ وہ بات جو آپ کے نزدیک صحیح نہیں اور آپ کا ضمیر اس سے متفق نہیں، صرف اس لیے نہ کہیے کہ آپ مقرر ہیں اور تقریر کرنے کی آپ سے فرمائش کی گئی ہے یا آپ طوعاً و کرہاً خطاب کرنے آ گئے ہیں۔ اس حالت میں آپ کی کامیابی مشکوک ہے۔ آپ مجروح احساسات کا شکار ہوں گے اور دورانِ تقریر آپ کے ذہن و زبان یا ضمیر و گفتار میں ایک ایسی کش مکش رہے گی جو خطابت کے لیے سمِ قاتل ہے۔ کوئی اسلوب،

کوئی تکنیک اور کوئی ڈھنگ، بے ریائی اور اخلاص کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ایک مقرر کی سب سے بڑی کامیابی اپنے افکار و خیالات سے اُس کا عشق ہے۔ عشق سچا ہو گا تو لوگوں کے جذبے کو محیط ہو گا اور خطیب کی آواز کا حُسن سامعین کے چہروں پر دمک اٹھے گا۔ خطابت میں دماغوں کو ورغلایا نہیں، جیتا جاتا ہے اور یہ فتح اس صورت ہی میں حاصل ہوتی ہے کہ جس صداقت سے مقرر کا دل معمور ہے، وہ سامعین کے دلوں میں اتار دی جائے اور لوگ بادۂ سخن سے سرشار ہو جائیں۔

۷-نکتہ آفرینی:

بات سے بات نکالنے اور نقطے سے نکتہ برآمد کرنا ایک فن ہے۔ اپنے خیال کو بلندی اور فکر کو پرواز عطا ہونے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا رہیے۔ خیال اگر باسی ہو جائے یا فکر پر پپڑی جم جائے تو سامعین کو سوائے بیزاری یا اکتاہٹ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ روایت سے باغی خطیب بہت کامیاب رہتے ہیں کیونکہ وہ تقریر کو فرسودہ خیالات کا پشتارہ نہیں بننے دیتے بلکہ نئے سے نیا خیال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تقریر کا معاملہ بھی شاعری کی طرح ہے۔ اتنی دیر خوشبو پھیلتی ہی نہیں، فضا معطر ہی نہیں ہوتی، جب تک کوئی تازہ ہوا کا جھونکا نہ آئے ؎

شکیبؔ اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اُس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

۸-تضاد و ترادف:

تقریری مقابلوں میں اکثر طالب علم مقرر مقفی اور مسجع پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ ہم آہنگ اور ہم وزن الفاظ کے استعمال سے صوتی رعنائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات متضادات و مترادفات کا ایک سیلِ رواں بھی سننے میں آتا ہے جو اپنی تندی میں

سامعین کو خس و خاشاک کی طرح بہائے چلا جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام عالم میں متضاد چیزوں کا وجود ہے اور ان میں مقابلہ اور مزاحمت ہے، مثلاً: حرارت و برودت، سکون و حرارت، انحلال و ترکیب، بہار و خزاں، ظلمت و نور، عزت و ذلت، صبر و غضب، عفت و فسق، جود و بخل۔ انہی کی باہمی کشمکش اور موازنہ سے یہ عالم قائم ہے ورنہ اگر ان میں صلح ہو جائے یعنی صرف ایک نوع کی چیزیں رہ جائیں تو عالم برباد ہو جائے"۔

۹-فطری انداز:

تقریر کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فطری انداز پیدا کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ حقیقی تاثرات سے کام لیا جائے۔ روح کی گہرائیوں سے پیدا ہونے والے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ تکلف پر مبنی مصنوعی انداز کبھی بلند پایہ اور دلکش نہیں ہوتا۔ خطابت کی جان جذباتِ قلبی کا صحیح اظہار ہے۔

ذیل کا پیراگراف پڑھیے اور ملاحظہ کیجیے کہ خطابت کے اعلیٰ محاسن پر مشتمل اس نادر شہ پارے میں کتنی بے تکلفی اور فطری پن ہے:

" تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام قادیانی میں یہ کمزوریاں اور عیوب تھے: اس کے نقوش میں توازن نہ تھا۔ قد و قامت میں تناسب نہ تھا۔ اخلاق کا جنازہ تھا۔ کیریکٹر کی موت تھا۔ سچ کبھی نہ بولتا تھا۔ معاملات کا درست نہ تھا۔ بات کا پکا نہ تھا۔ بزدل اور ٹوڈی تھا۔ تقریر و تحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے، لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی کمزوری بھی نہ ہوتی۔ وہ مجسمۂ حسن و جمال ہوتا۔ قویٰ میں تناسب ہوتا۔ چھاتی ۴۵ انچ کی، کمر ایسی کہ سی آئی ڈی کو بھی پتہ نہ چلتا۔ بہادر بھی ہوتا۔ مردِ میدان ہوتا۔ کیریکٹر کا آفتاب اور خاندان کا ماہتاب ہوتا۔ شاعر ہوتا۔ فردوسیِ وقت ہوتا۔ ابوالفضل اس کا پانی بھرتا۔ خیام اس کی چاکری کرتا۔ غالب اس کا وظیفہ خوار ہوتا۔ انگریزی کا شیکسپیئر اور اُردو کا ابوالکلام ہوتا،

پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو کیا ہم اُسے نبی مان لیتے؟ میں تو کہتا ہوں کہ اگر علی دعویٰ کرتے کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی نے دی۔ سیدنا ابوبکر صدیق سیدنا فاروق اعظم اور سیدنا عثمان غنی بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری انہیں نبی مان لیتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں! میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تختِ نبوت پر سج سکے اور تاجِ امامت ورسالت جس کے سر پر ناز کرے۔ والصلاۃ والسلام علیٰ سید الرسل و خاتم الانبیاء"

۱۰- سادگی ورنگینی:

فطری انداز کے ساتھ اسلوب بیان میں تنوع کی بھی ضرورت ہے۔ زبان اور الفاظ کی تمام آرائش کے باوصف تقریر اگر شروع سے آخر تک ایک ہی لب ولہجہ اور انداز میں ہو تو غیر دلچسپ ہو کر رہ جائے گی۔

بہترین طریقہ یہ ہے کہ تقریر کی ابتدا سادہ اور صاف الفاظ میں کی جائے اور موقع موقع سے رنگیں بیانی سے کام لیا جائے۔ مقرر کو اپنی پوری تقریر ایک ہی طرح کے پرشوکت الفاظ یا مرصع انداز میں ادا کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

تقریر کے بعض حصوں کو مرصع اور بعض کو سادہ چھوڑ دینے سے تقریر کا لطف اور اثر دوبالا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا مصوری میں ہلکے اور گہرے رنگوں کا استعمال۔ کہیں پھول، کہیں شبنم۔ خطابت میں کنایہ وتصریح کا مناسب استعمال بھی ایسا ہی ضروری ہے۔

۱۱- جدتِ ادا:

یعنی بات کسی نئے انداز سے کہی جائے۔ مطلب کسی نئے عنوان سے ادا کیا جائے۔ تقریر میں ادبی دلکشی پیدا کرنے کے لیے فقروں اور جملوں کی چستی اور ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مقرر اپنے خیالات کو حتی الامکان ایسے انداز میں پیش کرے جس میں ندرت اور انفرادیت ہو۔ اپنی طرف سے کوشش کرے کہ اس سے بہتر انداز ممکن ہی نہ ہو۔ دیکھیے ایک

مقابلے میں سو کے قریب منتخب طلبہ وطالبات شریک تھے مگر میدان اس کے ہاتھ رہا جس نے وہی بات جس کو ۹۹ آدمی کہہ چکے تھے، منفرد انداز میں کہی۔ اس تقریر کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں کم وقت میں بہت سی باتیں کہہ دی گئی تھیں اور اس تابڑ توڑ انداز میں تھیں کہ سامنے والے کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہنس کر خفت مٹائے یا برہم ہو کر اپنی رسوائی کا مزید سامان کرے۔ یہ تقریر متعدد ظاہری وباطنی محاسن پر مشتمل ہے اور بوجوہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر تاریخ کا حصہ بن چکی ہے:

"اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا بحران نظریاتی یکجہتی، فکری وحدت اور اتحاد کی محرومی ہے اور یہ محرومی ۵۸ سال گزرنے کے باوجود ابھی تک کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بنیادی پلیٹ فارم دیا گیا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" اس پر کنفیوژن پیدا کر دی گئیں۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ابھی تک پوچھا جا رہا ہے کہ پاکستان کیوں بنایا گیا ہے؟ قائد کا وژن کیا تھا؟ کیا یہ چیزیں بہت کلیئر نہیں اور کیا اس سوال کا جواب میں اور آپ دے سکتے ہیں یا وہ نسل دے سکتی ہے جس نے تخلیقِ پاکستان کے خاکے میں اپنے خونِ جگر سے رنگ بھرا تھا؟ کیا یہ ان کی روحوں کے ساتھ مذاق نہیں ہے؟ یہ ان کی قربانیوں کا مذاق ہے کہ آپ تو کٹ مرے اور ہمیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ آپ کا مسئلہ کیا تھا؟

دوسرا بڑا مسئلہ امن وامان کی دگرگوں صورتِ حال ہے اور بدقسمتی سے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا ذمہ دار اسلام ہے حالانکہ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام سب سے زیادہ زور امن وامان پر دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا تو ذرا دیکھیے، معیشت کی بات بعد میں کرتے ہیں، پہلے امن کی بات کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "**رب اجعل هذا البلد امنا**" الٰہی میری اس بستی کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ پھر فرماتے ہیں: "**وارزق اهله من الثمرات**" اس میں رہنے والوں کی معیشت بھی ٹھیک کر دیجیے اور اللہ تعالیٰ بھی جب اپنے انعامات گنواتے ہیں تو فرماتے ہیں: "**وإذ جعلنا البيت مثابة للناس وأمنا**" ہم نے آپ کے گھر کو ایک ایسی جگہ بنایا جہاں لوگ بار بار آئیں اور امن کا گہوارہ بنایا۔" یہ بات تو بالکل واضح ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا

امن وامان تباہ کیوں ہوا؟ ہمارا نوجوان کس طرح دہشت گردوں کا آلہ کار بنا اور ہم روز بروز لاقانونیت کی دلدل میں کیوں دھنستے چلے جارہے ہیں۔ نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ سبق ان کو کس مذہب نے سکھایا؟ یہ سبق اس کو کسی دین نے نہیں سکھایا۔ یہ طبقاتی تفریق، استحصالی نظام، ٹیلنٹ کی بے قدری، تعلیمی ڈھانچے کا کھوکھلا پن، بے روزگاری، بے انتہا کرپشن، اور اختیارات کا ناجائز استعمال وہ خوفناک مسائل ہیں جو نوجوانوں کو اس طرف لے کر گئے ہیں۔ یہ مسائل حل کر دیجیے پھر دیکھیے یہ نوجوان دہشت گرد ہیں یا امن پسند؟

تیسرا سب سے بڑا مسئلہ جو اس وقت بہت اہمیت کا حامل ہے، جمہوری روایات کا فقدان ہے۔ ہم ابھی تک حقیقی جمہوری کلچر اور عوامی مینڈیٹ کے احترام کے ماحول کو پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیوں، انتخابی دھاندلیوں اور اہم قومی مسائل پر پارلیمنٹ کو بائی پاس کرنے کی روایات نے عوام کا اعتماد موجودہ پولٹیکل سسٹم سے اُٹھا دیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے اس پڑوسی ملک سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ان کی اور ہماری تاریخِ آزادی ایک ہی ہے۔ ہمیں اور ان کو ایک جتنا وقت ملا ہے مگر انہوں نے اپنے ہاں جمہوری روایات کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ حکومت کتنی ہی ناکام ثابت کیوں نہ ہو جائے، کوئی بھی افتاد ٹوٹ پڑے، یہ نہیں ہو سکتا کہ فوج بیرکوں سے نکلے اور اقتدار میں آ کر بیٹھ جائے۔ اسی طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج ایوانِ صدر میں لگی قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر پوچھ رہی ہے کہ جنرل! تم تو سرحدوں کے رکھوالے ہو، تم کو ایوانِ اقتدار کی راہ کس نے دکھائی ہے؟

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ایلیٹ کلاس اکانومی ہے۔ حکومت کے اعداد و شمار کے جادوگر کہہ رہے ہیں کہ معیشت ترقی کر رہی ہے۔ زرِ مبادلہ کے ذخائر بڑھ رہے ہیں۔ قرضے کم ہو گئے ہیں۔ کشکول ٹوٹ گیا ہے۔ صدر بار بار کہتے ہیں پہلے ہم مانگنے جاتے تھے اب ہم دینے جاتے ہیں اور عوام حیران ہیں کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے کہ معیشت ترقی کر رہی ہے لیکن غریب کا چولہا بجھ رہا ہے۔ زرِ مبادلہ کے ذخائر بڑھ رہے ہیں لیکن پیٹرول کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

روپے کی قیمت ڈی ویلیو ہوتے ہوئے کہاں آکر کھڑی ہوئی ہے اور اس کے بعد ایک اور بات یہ ہے کہ جب ایک غریب شخص دیکھتا ہے کہ میرے پیٹ میں روٹی نہیں مگر میرے ملک کا صدر پتنگ بازی کر رہا ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی گیپ ہے، کوئی خلیج ہے۔ اس کے احساسات سے ایسا لگتا ہے کہ ایک گھر کے اندر میت پڑی ہو اور آپ اپنے گھر کے اندر ڈرم بجائیں کہ میں تو آزاد ہوں، غم تو تمہارا ہے میرا نہیں۔ تو کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دے گا بلکہ کہے گا کہ اس کا احساس کیجیے، اس کی اشک شوئی کریں، اس کو سینے سے لگائیں۔

اس کے علاوہ ایک بہت اہم بات جو ہم محسوس کرتے ہیں کہ بعض مسائل لہجے کی کرختگی کی وجہ سے بھی خراب ہوتے ہیں۔ صدر صاحب بلوچستان کے عوام سے کہتے ہیں، تمہیں ہم وہاں سے ہٹ کریں گے جہاں سے تمہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم نے تمہیں کہاں سے ہٹ کیا ہے؟ آپ قوم کے بڑے ہیں اس لیے آپ کو قوم سے اس انداز میں گفتگو کرنی چاہیے جس طرح آپ اپنے بیٹے بلال سے گفتگو کرتے ہیں۔ وردی کی بات تو آپ نے خود چودہ کروڑ عوام سے کہی تھی کہ میں ۳۱ دسمبر ۲۰۰٤ء کو وردی اُتار دوں گا، پھر قوم کے "وسیع تر مفاد" میں آپ وعدے سے مکر گئے اور نہ معلوم کب تک مکرے رہیں گے۔"

۱۲ - جذبات میں اعتدال:

ایسے موقعوں پر جہاں مضمون کے اعتبار سے پر جوش انداز یا تقریر میں خود بخود گرمی پیدا ہوتی ہو تو مقرر کو اعتدال سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ بغیر جوش کے تقریر بے کیف ہوتی ہے لیکن یہ بے کیفی غیر معمولی جوش کے اظہار سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ مقرر کو جلد جوش میں نہ آجانا چاہیے نہ اعتدال کا دامن چھوڑنا چاہیے بلکہ اس کے جوش میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونا چاہیے اور جوش کے نکتۂ عروج پر پہنچ کر بھی اعتدال کی رکابوں میں اس کے پاؤں مضبوطی سے جمے رہنا چاہییں۔ ورنہ سامعین پر سے اس کی گرفت جاتی رہے گی۔

تقریر کی خامیاں

۱- حروفِ ربط کا غلط استعمال:

بعض ادیب وخطیب حروف ربط کے استعمال میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔کئی ایک زبان کے سلسلہ میں معمولی آداب سے بھٹک جاتے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں "نے" کا غلط استعمال رواج پا چکا ہے۔ اکثر خطیب اور کئی ادیب اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ میں نے کراچی جانا ہے یا میں نے کھانا کھانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ صحیح فقرہ ہے: مجھے کراچی جانا ہے یا مجھے کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح حسب ذیل فقرے غلط ہیں:

(۱) یہ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ (۲) یہ تقریر میں نے سنی ہوئی ہے۔ (۳) یہ کتابیں میں نے پڑھی ہوئی ہیں۔

صحیح زبان یہ ہے:

(۱) یہ مرا دیکھا ہوا ہے۔ (۲) یہ تقریر مری سنی ہوئی ہے۔ (۳) یہ کتابیں مری پڑھی ہوئی ہیں۔

۲- بے معنی تکرار:

کسی لفظ، معنی یا مطلب کی بے جا تکرار سامعین کو بہت ناگوار ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ مضحکہ خیزی کا سبب ہو جاتی ہے۔ جہاں بات میں وزن اور زور پیدا کرنا ہو، وہاں الفاظ اور فقرات کی تکرار سے گریز کریں اس کے لیے اپنے ذخیرۂ الفاظ سے کام لیں اور مترادفات کی فہرست کو استعمال کریں۔ قدیم عرب کے نامور مقرر سحبان بن وائل کا ذکر کیا جا چکا ہے

کہ وہ گھنٹوں تقریر کرتا مگر کسی فقرے یا لفظ کو دوبارہ استعمال نہ کرتا۔ مثلاً اگر آپ کسی شخصیت کو عام لوگوں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل اقتباس پر غور کیجیے! کیسا خوبصورت تبصرہ کیا گیا ہے مگر کسی لفظ یا جملے کی تکرار نہیں۔

"وہ صاحب کردار ہم صاحب گفتار، وہ مینارۂ نور ہم آگہی سے دور، وہ پابند صوم وصلوۃ ہم گرفتار جمالیات، وہ پابندِ رکوع و سجود ہم فریفتۂ رنگ و نور، وہ مدحِ خوان ربِ جلیل ہم اسیر گیسوئے جمیل اور نگاہوں کے قتیل، وہ راستی کی کہکشاں اور عزیمت و استقامت کے کوہِ گراں ہم کھلنڈرے، لاپرواہ اور لاابالی نوجواں۔ اللہ اللہ! وہ کہاں ہم کہاں؟ ان کی سیرت کو قیدِ حروف میں محبوس کرنا برف پر کمادا گانے کے مترادف ہے۔"

الفاظ کا ذخیرہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، خیالات بہر حال ان گنت ہوتے ہیں اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی لیے ادیبوں اور خطیبوں کو بار بار تشبیہات اور استعارات سے کام لینا پڑتا ہے۔ تکرار سے بھی بچ جاتے ہیں۔ اور خوبصورتی بھی پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ مشکل پسندی:

جب آپ عوام سے مخاطب ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ بوجھل، پیچیدہ، ادق، نامانوس اور غیر معروف الفاظ سے پرہیز کریں اور یہ چیز ذہن میں رکھیں کہ دوراز کار استعارے، پیچ وخم میں لتھڑی ہوئی تشبیہیں، معمہ نما رمزیں، ملفوف کنائے اور مبہم محاورے عوام کے لیے پہیلیاں ہیں۔ ان سے مجمع من حیث الکل مستفید نہیں ہوتا اور نہ آپ ان کی معرفت عوام کے ذہنوں میں مطلوبہ پیغام اُتار سکتے ہیں۔

٤۔ خود پسندی:

اپنی شخصیت کو تقریر کے دوران بُت نہ بنایئے۔ نہ اپنی اہمیت جتایئے۔ آپ کی اہمیت آپ کی خطابت ہے۔ تکلّف سے بولنا خطابت کا ہکلا پن ہے اور خود پسندی خطابت کے

لیے زہر ہے۔ اپنی انا پر قائم رہنا شخصی کردار کا عیب ہے لیکن خطابت کے دوران انا کا اظہار اور اُس پر اصرار تو خود دشمنی وخودکشی ہے۔

۵- احساس برتری یا کمتری:

بعض مقرروں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ نقص ہوتا ہے کہ جس موضوع پر جلسہ ہو رہا ہے، وہ اُس کے متعلق سب کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں اور ساتھی مقرروں کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ چھوڑنا نہیں چاہتے یا کچھ مقرر اپنے سے بہتر مقرروں کی موجودگی سے مرعوب ہو کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ اپنے حدود میں رہیے۔ عوام کے لیے بار نہ بنیے۔ وہ دوسرے مقرروں کو بھی سننا چاہتے ہیں۔ جب ایک جلسہ میں کئی مقرر ہوں تو مجمع فرد واحد کے لیے نہیں، سب کے لیے ہوتا ہے اور اُن سب کے نام پر اکٹھا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جھٹلانا درست نہیں۔ اسی باعث بسا اوقات مجمع میں رنگا رنگ آوازیں اٹھنے لگتی ہیں اور سامعین ایک کی کاٹ پر دوسرے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سب سے اچھا مقرر وہی ہے جو ایجاز و اختصار میں صناعی و دلکشی قائم رکھے، عوام کے چہرے پر بیزاری کی شکن پیدا نہ ہونے دے اور وہ کسی موڑ پر تھکاوٹ کا شکار نہ ہوں۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ مجمع آپ کے ساتھ کب تک چلتا ہے؟ اور یہی ایک فن ہے جس سے خطابت کا سحر معلوم ہوتا اور اس کی تاثیر کے درجہ حرارت سے آگاہی ہوتی ہے۔ یہ چیز مشکل نہیں۔ ہر مقرر معلوم کر سکتا ہے کہ لوگ اس کی آواز سے کہاں تک پیوست ہیں اور اُس کے اثرات ان کے دماغ و دل پر کیا ہیں؟ ایک مقرر کے لیے عوام کی نگاہیں اور چہرے اس کا مقیاس ہوتے ہیں کہ وہ عوام میں کیا تاثر پیدا کر رہا ہے اور اس تاثر کی رفتار کیا ہے؟

٦- بے جا انکساری:

زبان و بیان سے متعلق ایک چیز مقرر کی خود اعتمادی ہے۔ اگر وہ معذرت کا لب ولہجہ

اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے بارے میں تذبذب کا شکار ہے اور جب مقرر تذبذب کا شکار ہو تو وہ اپنے منصب کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اُس کا مجمع سے کسی تحسین یا انصاف کی توقع رکھنا واہمہ ہے۔ ایک اچھا مقرر اپنی استعداد کے بارے میں بے جا انکسار نہیں کرتا۔ اپنے فرض سے متعلق معافی و معذرت نہیں چاہتا۔ کسی عنوان سے کسرِ نفسی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ اپنے جوہر کو منحنی الفاظ سے پسپا کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پورے اعتماد سے کہتا اور استغنا و استقامت کے لہجہ میں جماؤ سے بولتا ہے۔ اس قسم کے فقرے: "حضرات میں زیادہ وقت نہیں لوں گا، چند کلمات سماعت فرمائیے، مجھے اپنی کوتاہ فکری کا احساس ہے، میری غلطیوں سے چشم پوشی کیجیے" کسی خوبی کا اظہار نہیں بلکہ کمزوری کا اقرار ہیں۔ آپ اس لیے تقریر نہ کریں کہ آپ بولنا چاہتے ہیں یا آپ کو تقریر کا شوق ہے، آپ اس لیے تقریر کریں کہ لوگ خیر کی بات سننا چاہتے ہیں اور آپ کے وعظ کی مجمع کو ضرورت ہے۔ آپ خصائصِ خطابت پر قابو پا چکے ہیں۔ آپ کو ان کا ملکہ حاصل ہے۔ آپ کی آواز عطیہ الٰہی ہے۔ آپ کا فن انعامِ ایزدی ہے۔ آپ لوگوں سے اس لیے خطاب کریں کہ آپ کو یہ خوبی اسی لیے عطا ہوئی ہے۔ اس قسم کے وہبی عطیات نجی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ فیاضِ حقیقی کی جناب سے اس لیے عطا ہوتے ہیں کہ وہ ان سے مخلوق خدا کی خدمت کرے۔ اس صلاحیت کو بے جا انکسار سے گہن نہ لگائیے اور یہ چیز ذہن میں رکھیے کہ معذرت غلطیوں پر کی جاتی ہے، مصنوعی غلطیوں پر نہیں۔ آپ عوام سے جو کلمۂ حق کہنا چاہتے ہیں، اس پر اعتذار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔

۷۔ غیر ضروری متانت:

یہ ایک واضح امر ہے کہ عوام کے مجمعوں میں محض منطق یا نرا فلسفہ کام نہیں آتے اور نہ اعداد و شمار کی خشکی اور لب و لہجہ کی شقاوت تاثیر پیدا کرتی ہے۔ کئی مقرر غیر ضروری متانت

میں کھو کر عوام کو حقیقی جذبہ سے محروم رکھتے اور الفاظ کی بوجھل احتیاط سے مضمون کو کھلنے نہیں دیتے۔ اس طرزِ بیان کو کسی حد تک صحافت میں گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن خطابت کا مزاج اس سے قطعاً مختلف ہے۔ تقریر نام ہے دماغوں کو اُجالنے، دلوں کو بھڑکانے اور طبیعتوں کو اٹھانے کا اور یہ خوبی صرف سلاست و لطافت میں ہے کہ طبائع کی رنگارنگی کے باوجود مجمع میں ایک ایسی وجدانی وحدت پیدا کرتی ہے کہ عوام مقرر کے کہنے پر سر دھننے لگتے ہیں۔ اگر کوئی مقرر عوام کو اپنے ساتھ لے کر نہیں چلتا تو اُس کے متعلق یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ عوام کی نفسیات سے نابلد ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ مخاطبین کو مطمئن کرے۔ اس کے برعکس ادیب جو کچھ کہتا ہے اُس کے تاثر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ قرطاس و قلم کا انسان ہے۔ اس کے قارئین سامنے نہیں ہوتے اور نہ ان سے کلّی توافق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

۸- نفسیات ناشناسی:

بعض مقرر عوام کی نفسیات سے اعراض یا تجاہل کرتے اور اپنے ہی خیالات کے ہو کے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے، لہٰذا فضا کا احساس کیے بغیر کہے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اسٹیج پر قابو پانے سے وہ عوام پر قابو نہیں پاسکتے۔ ایک مقرر کو عوام کی ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طور پر یہ ضرور طے کر لینا چاہیے کہ وہ جس مجمع سے مخاطب ہے اس کو کتنی دیر ساتھ لے کر چل سکتا ہے؟ اور جس اجتماع کا مقرر ہے، اُس کا وہی مقررّ ہے یا دوسرے مقرر بھی ہیں اور اُن کا مقام کیا ہے؟ اکثر مقرر مجمع سے زیادہ اپنے خیالات کو عزیز رکھتے ہیں اور عوام کی اُکتاہٹ کو مطلقاً محسوس نہیں کرتے۔ داد کے روپ میں بیداد کا اندازہ نہیں کر پاتے اور کلمات ستائش کی منفی شکلوں کو بھانپ نہیں سکتے کہ ان پر تنقید و تعریض کے چھینٹے اُڑائے جا رہے ہیں۔ مقرر کا فرض ہے کہ مجمع کا تیور شناس ہو۔ جب اجتماع کے مقصد کا اعلان کیا جاچکا ہے تو لازم ہے کہ عوام کی نگاہوں سے اپنے مضمون کا

انتخاب کرے اور پہلی سوچ میں یہ فیصلہ کر لے کہ جو لوگ اس کے سامنے بیٹھے ہیں انہیں وہ کن الفاظ اور کس لہجہ سے کتنی دیر تک اپنا سکتا ہے؟ ایک مقرر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کی خواہش کے خلاف بولے جانا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس بے طلب خطابت ہی کا نتیجہ زبردست قہقہے اور تفریحی تالیاں ہوتا ہے۔

۹- غیر معتدل جذباتیت:

دورانِ گفتگو اس بات کا لحاظ رکھیں کہ بات بات میں جھنجھلاپن اور تیکھاپن کا ظہور نہ ہو اور نہ باتوں کی روانی میں جذباتی طور پر آدابِ مجلس کے حدود سے آگے بڑھ جائیں کیونکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عام طور پر جذباتی باتیں کہنے والا وقتی طور پر مجمع عام کو مسحور تو کر دیتا ہے اور تمام مجمع کو اپنا ہمنوا بنالیتا ہے، مگر یہ ایک وقتی چیز ہوتی ہے جس میں پائیداری نہیں ہوتی۔ اس کی مثال اس بادل کی ہے جو ایک سمت سے گرجتا اور چمکتا ہوا آیا اور اسی طرح گرجتا چمکتا ہوا ہواؤں کی لپیٹ میں اِدھر سے اُدھر چلا گیا، مگر جو بادل گرجتا اور چمکتا کم ہے وہ زیادہ برستا ہے۔ وہ کھیتوں اور باغات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے، لوگوں کو اسی سے فیض حاصل ہوتا ہے اور اس سے راحت و خوشی محسوس ہوتی ہے۔ بالکل یہی حال ان مقررین کا ہے جو جذباتی باتیں کرتے ہیں۔ وقتی طور پر وہ کچھ مفید اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں، مگر جہاں وقت ختم ہوا، ان کی مارکیٹ میں کچھ قیمت (ویلیو) نہیں رہ جاتی۔ ایسے بہت سے مقررین آج بھی موجود ہیں جو برساتی مینڈک اور پانی کے بلبلے کی مانند ثابت ہو رہے ہیں۔

ایک وقت میں اپنی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچاتے ہیں، مگر وقت نکل جانے کے بعد ان کو کوئی گھاس ڈالنے والا نہیں ہوتا۔ ع

پھرتے ہیں میؔر خوار کوئی پوچھتا نہیں

اس کے برعکس وہ مقررین اور خطبا جو اعتدال اور توازن کی راہ اپنائے ہوئے ہیں اور اسی راہ پر گامزن ہیں، ان کا ایک خاص مقام اور مرتبہ ہے، ان کی قیمت اور ویلیو ہے، وہ اچھی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ان کا قدم قدم پر شاندار اور پُر زور استقبال ہوتا ہے اور وہ اپنی جادو بیانی کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔ یقیناً ایسے مقررین اور واعظین سے لوگوں کو فیض حاصل ہوتا ہے اور ان کو روحانی فائدہ پہنچتا ہے۔

۱۰- ناقص پیغام:

بعض مقررین کے ذہن میں واضح نہیں ہوتا کہ سامعین کو حتمی پیغام کیا دینا ہے! اس سے مخاطب پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔اس کے دل و دماغ میں خلجان و خلش پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی تشفی نہیں ہو پاتی ،لہٰذا ناقص و ناتمام گفتگو نہ کریں۔ایسی کوئی بات نہ کہیں جس کا مطلب واضح نہ ہو نہ ایسی طولاتی مقدمات باندھیں جن کے اختتام پر سننے والے کو کسی پیغام یا خلاصے تک پہنچنے والی دشواری ہو۔وہی بات کارآمد ہے جو دل سے اُٹھے اور دل پر لگے۔ اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب واعظ کے دل میں موجود پیغام واضح ہو اور اسے سامع کے دل تک کسی الجھن کے بغیر براہ راست پہنچایا جائے۔

کامیاب تقریر کی چار صفات

وعظ یا خطابت میں چار صفات ایسی ہیں جو کامیابی کی ضامن ہیں۔عموماً ان سے بے توجہی کی جاتی ہے اور ان کی مشق کر کے انہیں اپنائے بغیر کوشش کی جاتی ہے کہ چیخنے چنگھاڑنے، گلا پھاڑنے، ہوا میں مکا بازی کرنے، ڈائس کو پیٹنے یا اسٹیج کو لرزانے کے ذریعے کامیاب مقرر بنا جائے۔آپ کوشش کیجیے کہ ان چار باتوں کو سمجھ کر اس طرح سے اپنی گفتگو میں سموئیں کہ آپ کی عادتِ ثانیہ اور طبعی مزاج بن جائیں۔ایسا ہو جائے تو یقین کیجیے کہ کامیابی آپ سے دور نہیں۔

۱-صحتِ تلفظ و ادا:

ہر لفظ کا صحیح تلفظ سیکھیے اور ہر فقرے کو اس کے صحیح طرز سے ادا کیجیے۔آپ کی گفتگو میں ایک رچاؤ اور جماؤ خود بخود پیدا ہو جائے گا جو سماعت کو نہایت بھلا لگے گا۔الفاظ کا صحیح تلفظ لغت کی کتابیں دیکھنے اور اہل علم کی صحبتوں میں ان کی گفتگو سننے سے آتا ہے۔

۲-صوتی تاثرات:

ہر لفظ یا فقرے کو اس کے معنی کی وضاحت اور اس کے حقیقی تاثر کا لحاظ رکھ کر بولیے۔ اس بات کا خیال رکھیے! کہ آواز کہاں بلند کرنی ہے کہاں پست؟ کہاں دھیمی رکھنی ہے اور کہاں اس میں گونج اور گرج سموئی ضروری ہے؟ کون سا جملہ اٹھان کا تقاضا کرتا ہے، کون سا زور دے کر بولنے کا اور کون سا ملائمت و ملاطفت کا؟ اس بات پر بھی توجہ دیجیے کہ کہاں رکنا ہے، کہاں نہیں رکنا اور کہاں کم رکنا ہے؟ ان سب تقاضوں کو سمجھیے اور آواز کے نشیب وفراز کو الفاظ و جملوں کے معنی اور تاثر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا گُر سیکھیے۔یہ بہت اہم چیز

ہے۔ایک ہی جملے سے صوتی تاثر کے ذریعے الگ الگ معنی پیدا کیے جاسکتے ہیں اور اسے مختلف مفاہیم میں بولا جاسکتا ہے۔مثلا:

"یہ شخص خطیب ہے۔"

اس جملے کو سادہ خبر یہ جملے کے طور پر بولنا ہو تو لہجہ کچھ اور ہوگا۔اگر استفہام مقصود ہو تو کچھ اور،اور اگر طنز یا استعجاب مطلوب ہو تو لہجہ یکسر مختلف ہو جائے گا۔آپ اس کی مشق کر کے تجربہ کر سکتے ہیں۔ لہجے کی طرز اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے گفتگو میں جان پیدا کرنا "صوتی تاثرات" کا وہ کمال ہے جس کی بنا پر اسے کامیاب تقریر کی صفتِ لازمہ قرار دیا جاتا ہے۔

آواز میں صوتی تاثرات پیدا کرنے کی مشق کے دو طریقے ہیں:

۱- مشہور خطبا اور خبر خوانوں (براڈ کاسٹرز) کو کان لگا کر سنیے کہ وہ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے صوتی تاثرات کیسے پیدا کرتے ہیں؟

۲- ان چار چیزوں کا اہتمام کرتے ہوئے کسی عبارت کو پہلے زیرِ لب تو لیے اور پھر بلند آواز سے پڑھیے:

(۱) صحیح تلفظ

(۲) موزوں لب ولہجہ

(۳) صحیح جگہ پر لمحہ بھر رکنا یا پورا سانس توڑنا۔

(٤) اتار چڑھاؤ کا اہتمام کرنا یعنی عام اور ہلکے پھلکے جملوں پر آواز کو دھیما یا نارمل رکھنا اور زوردار جملوں پر اس میں زور یا گرج گونج پیدا کرنا۔

۳-چہرے کے احساسات:

جو لفظ آپ زبان سے کہہ رہے ہیں اس میں حقیقی صوتی تاثر موجود ہونا ہی کافی نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی ادائیگی کے وقت آپ کے چہرے کے تاثرات واحساسات اس

کے معنی سے مناسبت رکھتے ہوں۔ جملہ استعجابیہ میں چہرے پر حیرت واستعجاب کی واضح پرچھائیں ہو، چیلنج دیتے وقت وہ جوش وجذبے سے تمتما رہا ہو، المیہ واقعہ سناتے وقت حزن و غم کے جذبات کا استعارہ ہو، لطیفہ یا چٹکلہ بیان کرتے وقت سراپا خندہ ہو اور سنجیدہ گفتگو کے دوران اس سے وقار ومتانت اور عام احوال میں بشاشت ولطافت ٹپکی پڑ رہی ہو۔ اگر خود خطیب کا چہرہ بے حسی اور مردنی کا شکار ہے اور اس کی گفتگو کا ساتھ نہیں دے رہا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے الفاظ خود اس پر اثر نہیں کر رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں سامعین سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ خطابت سے مطلوبہ اثر لے رہے ہوں گے؟؟؟

٤۔جسم کی حرکات وسکنات:

آپ نے "اعضا کی شاعری" کی ترکیب تو سنی ہوگی۔ اعضا کی زبان خطیب کو تقریر کے دوران بہت کام دیتی ہے اور اس کا ایسا ہتھیار ہے کہ جو آزمودہ بھی ہے، کارگر بھی اور ناگزیر بھی۔ خطیب جو کچھ زبان سے کہہ رہا ہے اگر اس میں صوتی تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اس کی گفتگو سحر انگیز ہوسکتی ہے۔ اگر چہرے کے احساسات بھی اس کے موافق ہیں تو یہ دو آتشہ ہے اور اگر جسم کی حرکات وسکنات کو گفتگو سے ہم آہنگ کرنے کا فن بھی اسے آتا ہے تو یقین کیجیے کہ وہ میدان مار چکا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل ہدایات کو ملحوظ رکھیے:

۱۔ ہر قسم کی حرکات وسکنات بالکل فطری انداز میں ہونا چاہییں۔

۲۔ زیادہ تر ہاتھوں کو استعمال کریں لیکن سر اور چہرے کی حرکات سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

۳۔ کسی بات سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے ہاتھوں کو سامنے لائیں اس انداز میں کہ ہتھیلیاں باہر کی جانب ہوں۔

٤۔ کسی دعوے کے لیے ہتھیلیاں کھول کر بازو لہرائیں۔

۵۔ رنج یا غصہ کے اظہار کے لیے ہاتھوں کو مصافحہ کے انداز میں سامنے باندھ لیں۔

٦- متنبہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سامنے بلندی کی طرف اُٹھائیں اس طرح کہ ہتھیلیاں سامعین کی طرف ہوں۔

٧- انگشتِ شہادت سے اشارہ، کے ذریعے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں، مثلاً: دلیل دیتے ہوئے انگشتِ شہادت سے سامنے کی طرف اشارہ کریں۔ جب آپ یہ کہہ رہے ہوں کہ "یہ اصول غلط ثابت ہو چکا ہے" اس وقت یوں اشارہ کریں جیسے یہ اُصول مجسم آپ کے سامنے کھڑا ہوا اور آپ اس پر خطِ تنسیخ پھیر رہے ہیں۔ اسی طرح الزام لگاتے وقت یا چیلنج دیتے وقت اس انگلی کا اشارہ بہت موزوں ہے۔

٨- جب آپ تعاون کی اپیل کر رہے ہوں تو اپنا ہاتھ اس انداز میں آگے بڑھائیں جیسے آپ کچھ وصول کر رہے ہوں۔ ہتھیلی اس صورت میں اوپر کی طرف ہونی چاہیے۔

٩- جب آپ کسی خیال کی مذمت کر رہے ہوں تو ہاتھوں کو اس انداز میں حرکت دیں جیسے کسی گندی چیز کو آپ دھکیل کر الگ یا دور کر رہے ہوں۔

١٠- جذبات اور عزم کے اظہار کا ایک اہم طریقہ بند مٹھی یا مُکا ہوا میں لہرانا ہے۔

١١- جب آپ دو قسم کے خیالات اور نظریات کو الگ کر رہے ہوں تو ہاتھوں کی مدد سے بھی انہیں الگ الگ کرنے کا اظہار کریں، مثلاً: "ہمیں اب فیصلہ کر لینا ہوگا۔ یا مکمل اس طرف یا پورے کے پورے اُس طرف۔" لفظ "اِس طرف" پر آپ ایک ہاتھ کو ایک طرف لے جائیں اور "اُس طرف" پر دوسرے ہاتھ کو دوسری طرف۔

١٢- اور جب دو چیزوں کو یک جان و یک قالب ظاہر کر رہے ہوں یا اتحاد و اتفاق کی ترغیب دے رہے ہوں تو دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال کر انہیں یک جہتی اور بنیان مرصوص کی بولتی تصویر بنا دیں۔

تقریر کے اُصول

عصرِ حاضر میں جہاں دوسرے علوم وفنون کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے وہاں فنِ تقریر کے سائنسی تجزیہ اور مطالعہ کی طرف بھی پوری توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ گفتگو اور تقریر کے فن پر مستقل تصنیفات کی گئی ہیں۔ اچھی تقریر کے متعلق ذیل کی باتوں پر تقریباً سبھی مصنفین متفق نظر آتے ہیں۔ اس لیے انہیں "تقریر کے بنیادی اصول" کہا جا سکتا ہے۔

۱- بھرپور تیاری:

(۱) تقریر کرنے سے پہلے اس کی تیاری پر خُوب محنت کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں پہلا مرحلہ غور وخوض کا ہے۔ جتنا اہم موضوع ہوگا اتنا ہی زیادہ اس پر غور وخوض ہونا چاہیے۔

(۲) متعلقہ مواد کا تفصیلی مطالعہ نہایت ضروری ہے اور اس تفصیلی مطالعہ میں ابتدائی کتابوں سے لے کر انسائیکلو پیڈیا تک سے کام لینا چاہیے۔

(۳) اس کے بعد بہترین خیالات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کیونکہ جتنا کچھ پڑھا گیا وہ سب تو ایک تقریر کے اندر سما نہیں سکتا۔ خیالات کا عُمدہ انتخاب تقریر کی عمدگی کا ضامن ہے۔

(٤) اچھی تقریر کے لیے تقریر کا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے۔ جس طرح کوئی عقلمند معمار نقشے کے بغیر مکان تعمیر کرنے کا ارادہ نہیں کرتا اسی طرح کوئی اچھا مقرر تقریر کا خاکہ تیار کیے بغیر تقریر کا ارادہ نہیں کرتا۔

۲- اندازِ خطاب:

(۱) تقریر کے انداز میں تصنع نہ ہو۔ قدرتی اور بے تکلفانہ انداز اختیار کیا جائے۔

تقریر میں گفتگو کا فطری انداز سامعین کی توجّہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور مقرّر و سامعین کے درمیان خوشگوار رابطے کا کام دیتا ہے۔

(۲) تقریر کے لیے موزوں تیاری ضروری ہے لیکن تحریری نوٹ لے کر ان کی مدد سے تقریر کو آگے چلانے کی کوشش عام طور پر خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرتی۔ اگر ان کو خوبی اور چابکدستی سے استعمال نہ کیا جائے تو یہ نوٹ مقرر اور سامعین کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور ان کا ذہنی رابطہ قائم نہیں رہتا۔

(۳) ہاتھ کے اشاروں، چہرے کے تاثرات اور سر اور آنکھوں کی حرکات سے تقریر میں اثر بڑھتا ہے لیکن حرکات وسکنات قدرتی ہونی چاہییں۔ اگر ان میں اداکاری کا بناوٹی رنگ آجائے تو سامعین مقرر کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔

(٤) آواز نہ اتنی بلند ہو کہ مقرر چیختا چلّاتا سنائی دے اور نہ اتنی دھیمی کہ تمام سامعین تک بخوبی پہنچ ہی نہ سکے۔

(۵) مائیک سینس بھی بہت اہم چیز ہے۔ بیان کے دوران دائیں بائیں متوجہ ہوتے وقت سینہ تو موڑیں لیکن منہ کو مائیک کے سامنے سے نہ ہٹنے دیں تاکہ آواز کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

۳- معنوی صفات:

ظاہری صفات کے علاوہ عمدہ تقریر کے لیے بعض اہم معنوی صفات بھی ضروری ہوتی ہیں جو اچھے مقرر کی تقریر میں شعوری کوشش کے بغیر ہی ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن ان صفات کو اپنے لاشعور میں جذب کرنے کے لیے ابتدائی زمانے میں ٹھوس اور مثبت کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چند صفات حسب ذیل ہیں:

(۱) موضوع کا واضح تصور اور اس کی اہمیت کا ادراک

(۲) موضوع کے متعلق تفصیلی معلومات

(۳) مکمل خود اعتمادی

ان تین باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں آپس میں اس طرح مربُوط اور منسلک ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔

جب تک موضوعِ تقریر کا واضح تصور ذہن میں نہ ہوگا اور جب تک اس کی اہمیت کا ادراک پوری طرح نہ ہوگا اس وقت تک تقریر کی کوشش ایک سعی لاحاصل سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔ اگر مقرر خود ہی موضوع کی اہمیت سے آگاہ نہ ہوگا تو سامعین کو اس سے متعلق کیا بتا سکے گا اور خود اس کے اندازِ تقریر میں خلوص اور جوش وجذبہ کہاں سے آئے گا؟

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ جب مقرر کو موضوع کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوں گی تو اس کے ذہن میں موضوع کا واضح تصور کیونکر پیدا ہوگا اور وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکے گا کہ اس نے سامعین کے علم میں کچھ اضافہ کیا ہے؟

پھر اس چیز سے تو کسی کو انکار کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ مقرر کے اندر خود اعتمادی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب وہ اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی ہو۔ اور موضوع پر پوری طرح حاوی ہونے کے لیے تفصیلی مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

لیکن جس طرح تیراکی کے اصُول وضوابط پر عبور حاصل کرنے سے انسان تیراک نہیں بن سکتا اسی طرح فن تقریر کے اسرار ورموز پڑھ لینے سے انسان مقرر نہیں ہو جاتا۔ تیرنے کے لیے عملی طور پر پانی میں چھلانگ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تقریر کا فن سیکھنے کے لیے آدابِ خطابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقریر کرنا اور مطلوبہ صفات کے حصول کی مشق کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے فطری صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور وہ نکھر کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان زمانوں میں بھی جب فنِ تقریر پر سائنسی انداز سے بحث نہ ہوتی تھی اور لوگ اس فن پر تکنیکی طور سے حاوی نہ ہوتے تھے، دنیا کے تمام ممالک میں بڑے بڑے

خطیب پیدا ہوتے رہے۔ خود ہمارے برصغیر میں جہاں دعوتی نظام جو فی الواقع فن تقریر کی پرورش گاہ ہوتا ہے، پوری طرح موجود نہ تھا، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ایسے ایسے خطیب پیدا ہوئے کہ ان میں سے بیشتر لوگوں کے ملفوظات سونے کے پانی سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

آدابِ خطابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مشق کیسے کی جائے؟ اس سوال کا کوئی نیا جواب دینے سے پہلے ہم گزشتہ تین باتوں میں سے پہلی دو کو دوبارہ تفصیل سے بیان کریں گے پھر تقریر کو مؤثر بنانے والی چند باتیں ذکر کریں گے۔

تقریر کی صحیح تیاری کا طریقہ:

١- اساتذہ اور اہلِ ذوق حضرات کی مدد سے کتابوں کا انتخاب، انسائیکلو پیڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ سے معلومات کا حصول۔

٢- متعلقہ مواد کا گہرا مطالعہ اور گہرا غور وخوض۔

٣- بہترین خیالات کا انتخاب۔ ایک سو خیالات جمع کریں۔ ان میں سے نوّے خیالات ضائع کردیں۔ مواد اور مقررہ وقت کے باہمی تناسب کا خیال رکھیں۔

٤- تقریر کا خاکہ تیار کرنا اور پھر اس میں رنگ بھرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مراجعت کرتے رہنا۔

٥- تقریر آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق ہونی چاہیے۔ مختلف قسم کا مواد دماغ میں موجود ہو لیکن تقریر خود پھلے پھولے اور لاشعوری طور پر پروان چڑھے۔

٦- ایک دانشور کا قول ہے: "الفاظ کے پیچھے مت بھاگو، بلکہ خیالات کی تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہوگا تو الفاظ خود بخود چلے آئیں گے۔"

اندازِ خطاب کی خوبیاں:

١- انداز بیاں دلنشیں اور دلچسپ ہونا چاہیے۔

۲- اندازِ تقریر اور لہجہ فطری ہونا چاہیے۔ یہ محسوس نہ ہو کہ آپ نے رٹّا لگا کر تیاری کی ہے۔

۳- تقریر کے وقت آپ کو تازہ دم، خوش لباس اور باوقار ہونا چاہیے۔ اگر تقریر سے پہلے سامعین کے سامنے بیٹھنا ہو تو کرُسی پر باوقار انداز میں تن کر بیٹھیں۔

٤- تحریری نوٹس مقرر اور سامعین کے تعلق کو مصنوعی اور پُرتکلف بنا دیتے ہیں اور ان کی باہمی رفاقت میں حائل ہوتے ہیں۔ ان سے استفادہ چابکدستی اور بیدار مغزی کا تقاضا کرتا ہے۔

۵- اپنے بیان میں اپنی انفرادیت سمو دیں۔ ایک عام بات اور ایک عظیم بات میں یہی فرق ہے۔

٦- اسٹیج پر مصنوعی اداکاری نہیں دکھانا چاہیے۔ حرکات وسکنات بالکل فطری اور بے ساختہ ہونی چاہییں، جیسے سانس لینے کا عمل۔

۷- تقریر میں مزاح کا عنصر موزوں حد تک ہونا چاہیے۔ مکمل مسخرا پن اس کی افادیت کھو دیتا ہے۔

۸- استفہامی انداز میں تجسس پیدا کریں، مثلاً:

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی سترہ قومیں آج بھی غلام ہیں؟"

۹- تقریر کا اختتام بالکل اچانک اور غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے۔ اشعار پر تقریر ختم کرنا بہت بہتر ہوتا ہے۔

۱۰- آخر میں کہی ہوئی بات زیادہ دیر تک یاد رہتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نقطۂ عروج پر تقریر ختم کریں۔

تقریر کو مؤثر کیسے بنایا جاتا ہے؟

یہاں تقریر کی تیاری سے لے کر اختتام تک کے مختلف مراحل کے دوران کام آنے والی چند ایسی باتیں لکھی جاتی ہیں جن سے تقریر میں جان اور تاثیر پیدا ہوتی ہے:

۱- غور وفکر اور جذبات:

پہلی چیز گہرا غور وفکر اور پھر حاصل فکر میں جاندار جذبات کی آمیزش ہے۔

☆......غور وفکر:

غور وفکر ایسی چیز ہے جو تقریر کو مؤثر بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے درج ذیل مراحل ہوتے ہیں:

۱-مسئلہ کا واضح تصور۔

۲-اس کی صحیح نوعیت اور اہمیت کا ادراک۔

۳-ماحول اور معاشرہ سے اس کے تعلق کا تعین۔

٤-مسئلہ کا صحیح حل۔

☆......جذبات کی تاثیر:

انسان صرف عقل اور فکر سے کام نہیں لیتا۔ زیادہ تر جذباتی عمل اور ردِ عمل انسانی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مقرر کو جذبات سے مناسب انداز میں اپیل کرنی چاہیے۔ لازمی ہے کہ مقرر خود اپنے موضوع کے بارے میں صادقانہ جذبات رکھتا ہو ورنہ وہ سامعین کے جذبات میں تلاطم پیدا نہ کر سکے گا۔

۲- موضوع کے بارے میں مکمل معلومات:

☆ ......مقرر کو کبھی بھی طے شدہ اُصولوں اور معلومات سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

بنیادی صداقتوں کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے، مثلاً: ''جھوٹ بولنا گناہ ہے۔''

''غلط اور نامکمل معلومات کبھی بھی کامیاب ابلاغ کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔''

☆ ......موضوع کے متعلق ماہرین کی رائے ضرور معلوم کرنا چاہیے اور غیر متعلقہ مواد کے مطالعہ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

☆ ......بہت سی باتیں براہِ راست مشاہدہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ مقرر کی قوتِ مشاہدہ اعلیٰ ہونا چاہیے۔

☆ ......تاریخ کا گہرا مطالعہ ہمیشہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مقرر کو تاریخ سے ضرور دلچسپی ہونی چاہیے۔

☆ ......کلاسیکل مقرروں کی تقریروں کا مطالعہ اور سماعت بڑی حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے۔

۳- اسٹیج کے آداب:

☆ ......اسٹیج پر آتے ہی سامعین سے فوری رابطہ قائم کر لینا چاہیے۔ یوں محسوس ہو کہ آپ ان سے ذاتی طور پر مخاطب ہیں۔

☆ ......اسٹیج پر سیدھے، باوقار لیکن پرسکون طریقے سے پوری طرح چاق و چوبند کھڑے ہوں۔

☆ ......ہاتھوں کو جیبوں میں نہ ڈالیں، سینے پر نہ باندھیں اور نہ ہی کولہوں پر رکھیں۔

☆ ......اسٹیج کے علاوہ بھی اچھے انداز میں نشست و برخاست اپنی عادتِ ثانیہ بنا لیں۔

☆ ......اسٹیج پر اپنی جگہ بدلنے سے سامعین کی توجہ بیدار کی جا سکتی ہے لیکن حرکت

بالکل فطری انداز میں ہونی چاہیے۔

☆ .... مسلسل چلنے پھرنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس صورت میں سامعین کی توجہ جو کچھ مقرر کہہ رہا ہو اس سے ہٹ کر اس کی حرکات پر مرکوز ہو جائے گی۔

☆ .... اسٹیج پر آنا بھی باوقار طریقہ سے چاہیے اور جانا بھی اسی طریقہ سے چاہیے تاکہ پہلا اور آخری تاثر اچھا ہو۔

چند کارآمد گُر:

۱۔ مکمل خود اعتمادی، دلجمعی اور بشاشت کے ساتھ جاندار انداز میں تقریر کا آغاز کریں۔

۲۔ گھسے پٹے روایتی الفاظ اور پرتکلف و پرتصنع کلمات سے گریز کریں۔

۳۔ ریاکارانہ تواضع فضول چیز ہونے کے علاوہ سامعین پر برا اثر چھوڑتی ہے کہ یہ شخص کم علم ہے یا خود سے ہمارے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا تھا، کسی کے حکم پر آیا ہے تو ہمیں کیا دے گا اور ہم اس سے کیا استفادہ کر پائیں گے؟

٤۔ تقریر کے انداز میں تصنع نہ ہو۔ اثر آفرینی مقصود ہے تو گفتگو کا فطری انداز اختیار کریں۔

۵۔ تقریر کے دوران ذہن کو بیدار اور توجہ کو حاضر رکھا جائے۔

٦۔ تقریر کو موضوع کے متعلق اور واضح رکھا جائے۔ غیر متعلق اور مبہم باتیں نہ کی جائیں۔

۷۔ تقریر کے دوران غیر ضروری حرکات سے اجتناب کریں، مثال کے طور پر:

.... سامنے پڑی ہوئی کسی چیز مثلاً گلاس وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ۔

.... اپنے لباس، ٹوپی وغیرہ کو درست کرنا یا بٹن سے کھیلنا۔

.... سر کھجانا یا ناک یا چہرے پر ہاتھ پھیرنا۔

.......ہاتھ جیبوں میں ڈالنا یا کولہے پر دھرنا۔

.......ڈیسک کا سہارا لے کر اس پر جُھک جانا۔

۸-اگر موضوع بہت سنجیدہ یا خشک ہو تو اس میں مناسب مزاح کی چاشنی ملائیں۔

۹-اگر تقریر کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہو اس کا احترام کریں۔یوں بھی طول بیان سے احتراز کریں۔

۱۰-ایک خوب صورت بلند آہنگ آواز قابلِ رشک چیز ہے۔کوشش کر کے اور مسلسل مشق سے آواز کی درشتی دُور اور اس میں ردھم پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۱۱- بولتے وقت ایسے تمام اعضا کو پوری طرح استعمال کریں جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں،مثلاً: دانت،منہ،ہونٹ،گلا،پھیپھڑے وغیرہ۔

۱۲- اس طرح بولنے کی مشق کریں کہ دماغ کی رگوں پر کھنچاؤ نہ پڑے۔بس یہی اعضا استعمال ہوں جن کا ذکر ہوا۔

۱۳-آواز نہ اتنی بلند ہو کہ ناگوار محسوس ہو اور نہ اتنی دھیمی کہ سنی نہ جا سکے۔کسی بھی موقع پر "دھاڑنے" کی ضرورت نہیں۔

۱٤-سامعین سے اپنائیت کا رویّہ اپنائیں۔لہجے میں درشتی یا چہرے پر استغنا دیکھنے سننے والوں پر برا اثر ڈالتا ہے۔

۱۵-دائیں بائیں اور سامنے بیٹھے تمام سامعین کو یکساں توجہ دیں۔ایسا نہ ہو کہ آپ کسی ایک طرف زیادہ متوجہ رہیں اور دوسری طرف والوں کو آپ کا چہرہ پورا دیکھنے کا ہی موقع نہ ملے۔

۱٦-اہم ترین بات یہ کہ بولتے وقت سامعین کی آنکھوں میں نہ دیکھیں۔اس سے قوتِ گویائی اور فہم متاثر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات یاد بھی نہیں رہتا کہ کیا بول رہے تھے؟ عرفاً بھی اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔

تقریر سیکھنے والے کے لیے گیارہ نصیحتیں

چند موٹی موٹی باتیں ایسی ہیں جو مقرر کو اپنے پلّے باندھ لینی چاہییں:

۱- وضع قطع:

نئی جگہوں پر جہاں سے لوگ مقرر واقف نہ ہوں، اس کی ظاہری وضع اور اس کے لباس وغیرہ کا بہت ہی اثر پڑتا ہے۔ لباس یا حلیے سے اگر پھوہڑپن چھچھوراپن عیاں ہے تو تقریر ضرور بے اثر رہے گی۔ مقرر کو ہمیشہ وہی وضع قطع اختیار کرنی چاہیے جس میں سادگی ہو اور جو علاقے میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہو۔

۲- مکرر باتیں:

دورانِ تقریر ایک ہی بات کو بار بار کہے جانا یا کسی لفظ کو تکیۂ کلام بنالینا بُرا اثر پیدا کرتا ہے۔ تاکید کی ضرورت سے بعض خاص خاص باتوں کو اگر ایک سے زیادہ بار بیان کرنا ہی پڑے تو کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ہر مرتبہ اسلوبِ بیان نیا ہو۔ اس کے لیے مترادف الفاظ کا سہارا لینا چاہیے۔

۳- ایک خاص گُر:

حاضرین کی کوئی تعریف کر دینا یا انہیں یاد دلانا کہ اسی قسم کے موقع پر انہوں نے پہلے کیا کیا تھا، بہت کام دیتا ہے اور گزشتہ کارناموں کی یاد اکثر بہت ہی جوش پیدا کر دیتی ہے۔ اسلاف کے کارناموں کی مثالیں بھی اسی غرض کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ لوگوں سے بالخصوص جاہل عوام سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے باپ دادا نے ایسے ایسے

کام کیے تھے تو ان کے دل جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں اور وہ ہر قسم کے خطرات میں پڑنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

کسی ایسے شخص کی وصیت جو قوم کا محبوب تھا اور اب مر چکا ہے بہت جوش پیدا کر دیتی ہے۔ بالخصوص جبکہ مقرر حاضرین کو مخاطب کر کے یہ سوال کرے کہ کیا اب فلاں شخص کا نام لینے والا کوئی بھی باقی نہیں ہے؟ یا یہ کہ فلاں شخص کے ایثار کی ہمارے دل میں کوئی قدر نہیں ہے؟ وغیرہ۔

سامعین کی قومی خصوصیات کا ذکر کر کے ان کی بنا پر ان سے کسی کام کی اپیل کی جائے تو اکثر بیکار نہیں جاتی۔ مثلاً: پختونوں اور راجپوتوں سے اگر یہ کہا جائے کہ بہادری اور شجاعت ہمیشہ پختونوں اور راجپوتوں کی خصوصیت رہی ہے، کیا آج وہ خصوصیت جاتی رہی؟ یا مسلمانوں سے یہ کہا جائے کہ حق و انصاف کی خاطر جان دینا ہمیشہ ایک مسلمان کا شعار رہا ہے، کیا آج بھی کچھ مسلمان ایسے ہیں کہ جو حق کی حمایت میں جان دینے پر آمادہ ہوں؟ تو یقیناً اس کا اثر نہایت اچھا ہوگا۔

٤- حاضر دماغی:

وضع قطع اور ہمت و جرأت کے بعد مقرر کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ حاضر دماغی ہے۔ جن لوگوں کی طبیعت حاضر رہتی ہے وہ ناموافق اور مخالف باتوں کو محض اپنی ذہانت سے اپنے موافق بنالیا کرتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور موقع دیکھ کر اسی کے مطابق تقریر کرنا حاضر دماغی پر منحصر ہے۔

وہی باتیں جن کا اگر معقول جواب نہ دیا جائے تو ضرور مقرر کے خلاف جائیں گی، جب ان کا اچھا جواب دے دیا جائے تو مقرر کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوتی ہیں اور وقت پر فوراً ایسے جواب دینا صرف حاضر دماغی سے ہی ممکن ہے۔

جن دنوں شدھی کی تحریک کا زور تھا (یعنی مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک جو شردھانند نامی ایک ہندو نے چلائی تھی) ان دنوں راجپوتوں کے ایک گاؤں میں ایک مبلغ کا گذر ہوا جہاں نومسلم راجپوت، ہندوؤں کی کوششوں سے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ شدھی کرالیں۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ تمہارے باپ دادا کو مسلمانوں نے زبردستی مسلمان بنالیا تھا اور یہ بات پورے گاؤں کے دل میں کچھ ایسی جم گئی تھی کہ سب کے سب اسلام سے بددل ہو گئے تھے۔ مسلمان مبلغ نے جب دیکھا کہ رنگ بگڑا ہوا ہے تو اس نے بھرے مجمع میں یہ سوال کیا کہ آخر اسلام میں انہیں کیا خرابی نظر آئی جو وہ اس سے بیزار ہو چلے؟ جواب میں ایک راجپوت نے اُٹھ کر بلند آواز میں کہا: ''ہمارے باپ دادا کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا تھا۔'' مسلمان مبلغ نہایت اطمینان کے ساتھ مسکرایا اور بولا:

''راجپوت کبھی تلوار کے ڈر سے اپنا دھرم نہیں چھوڑا کرتے۔ آپ کے باپ دادا راجپوت تھے اور انہیں دنیا کی کوئی طاقت زبردستی مسلمان نہیں بنا سکتی تھی۔ کیا آپ اپنے باپ دادا کو ایسا ڈرپوک اور بزدل سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تلوار کے ڈر سے اپنا مذہب بدل دیا ہوگا؟ کسی نے آپ کو بہکا دیا ہے۔ ایسی بات پھر کبھی منہ سے نہ نکالیے گا۔''

اس ذرا سی حاضر جوابی نے تمام گاؤں کو مرتد ہونے سے روک دیا۔

۵- نفسیات شناسی:

نفسیات کا علم بھی مقرر کا بہت ہی کارآمد ہتھیار ہے اور اس کے بغیر اکثر مواقع پر مقرر کو ناکامی ہوتی ہے۔ مجمع کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسی کے مطابق تقریر کی جائے تو بہت کچھ اثر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اگر مجمع کی ذہنیت کا اندازہ کیے بغیر کوئی بات ایسی کہہ دی گئی جس سے سارا مجمع مشتعل ہو گیا تو پھر تقریر کی ناکامی یقینی ہے۔

پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت جاہل عوام کے مجمع کو قابو میں لانا زیادہ مشکل ہوتا ہے،

کیونکہ ان میں معقولیت بہت کم ہوتی ہے اور انہیں مسخر کرنے کے لیے ایسی ہی باتیں کرنی پڑتی ہیں جو ان کے سمجھنے کی ہوں اور جس پر انہیں یقین آ سکے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع اگر مقرر کے خلاف ہے اور شرارت پر آمادہ ہے تو اس پر غلبہ حاصل کر لینا مقرر کی انتہائی مشاقی اور مہارت کی دلیل ہے اور اس سے بڑی اور کوئی کامیابی مقرر کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

نفسیات کا علم مقرر کو ان باتوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے جو انسان کی طبیعت میں رنج و غم خوشی و مسرت کا اثر پیدا کرتی ہیں اور اس علم کی مدد سے وہ نہایت آسانی سے حاضرین پر اپنی مرضی کے مطابق اثرات طاری کر سکتا ہے۔

حاضرین کو مخاطب کرنے کے لیے شروع میں جو جملہ استعمال کیا جائے وہ ان کی حیثیت اور حالت کے مناسب ہونا چاہیے۔ کسی عالمانہ جلسہ میں جہاں سامعین سب علماء ہوں اگر اس طرح خطاب کیا جائے: ''میرے پیارے بھائیو یا دوستو یا سجنو!'' تو غالباً بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوگا، لیکن یہی جملے یا الفاظ عوام کے مجمع کے لیے بالکل موزوں اور مناسب ہیں۔

موقع محل کو پہچاننا اور اسی کی مناسبت سے اپنی تقریر کو ڈھال لینا درحقیقت ذوقِ سلیم کا کام ہے اور ذوقِ سلیم کے بغیر کوئی شخص کسی فن میں بھی کامل نہیں بن سکتا۔ ایک سیاسی جلسہ میں جہاں جوش پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور لوگوں کے جذبات میں حرکت پیدا کرنی ہوتی ہے، وہاں تقریر شروع کرتے وقت اگر محترم حضرات یا معزز سامعین کہہ کر مجمع کو مخاطب کرنے کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ پاک وطن کے جانبازو! سرزمینِ پاکستان کے بہادر فرزندو! تو ظاہر ہے کہ یہ زیادہ اثر پیدا کرے گا۔

٦۔ معلوماتِ عامہ:

مقرر کی عام واقفیت بھی بہت ہی اچھی ہونی چاہیے۔ ہر علم اور ہر فن کے موٹے موٹے

اصولوں اور بنیادی معلومات سے آگاہی اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ بعض بالکل معمولی سی باتیں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی مقرر کی تمام کوششیں بیکار چلی جاتی ہیں اور اس کا مذاق اُڑ جاتا ہے۔ ایک مقرر صاحب کسانوں کی تباہ حالی بہت ہی مؤثر الفاظ میں بیان کر رہے تھے اور مجمع پر بہت ہی اچھا اثر ہو چکا تھا کہ تقریر میں انہوں نے کہا: ''اس مرتبہ برسات کا موسم بھی یوں ہی گزر گیا اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے گیہوں اور چنے کوئی چیز پیدا نہ ہوسکی۔'' مجمع سے جب قہقہوں کا شور بلند ہوا تو وہ بیچارے بہت ہی پریشان ہوئے کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ چنے اور گیہوں برسات میں پیدا نہیں ہوتے۔

سائنس کے عجائبات سے واقف ہونا بھی مقرر کے بہت کام آتا ہے اور بعض اوقات وہ حیرت انگیز طریقہ پر قدرت کے کرشموں سے تشبیہ اور استعارہ کا کام لے لیتا ہے۔

بعض کم علم آدمی بھی بہت اچھے مقرر ہوتے ہیں اور اپنی تقریر سے مجمع پر جادو سا کر دیتے ہیں، لیکن یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو قدرت سے غیر معمولی استعداد لے کر آئے تھے اور جنہیں اگر تعلیم میسر آجاتی تو یقیناً دنیا کے بہترین مقرروں میں سے ہوتے۔ جو لوگ غیر معمولی قدرتی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کو مقرر بننے کے لیے سیکھنا اور سیکھتے رہنا لازمی ہے۔

۷- عادتیں اور رویّے:

- عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بیٹھ کر تقریر کرنے کی بہ نسبت آدمی کھڑے ہو کر بہت اچھی تقریر کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ کھڑا ہوتا ہے اور سامعین بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ سب سے اونچا ہوتا ہے اور اس کا دل ان سب پر ایک قسم کی فوقیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنے سے زیادہ لمبے قد کے آدمی سے باتیں کرتے وقت انسان ہمیشہ ایک قسم کی پستی اور عجز سا محسوس کیا کرتا ہے اور اپنے سے چھوٹے قد کے آدمی سے باتیں کرتے

وقت وہ بہت ہی دلیر ہوتا ہے اور اس کے دل میں احساسِ فوقیت موجود رہتا ہے۔

- بعض مقررین اس بات کے عادی ہوجاتے ہیں کہ دورانِ تقریر کسی چیز کا سہارا موجود ہو یا وہ ڈائس کا ایک کنارہ برابر پکڑے رہتے ہیں۔ بعض مقرر عصا ہاتھ میں رکھنے کے عادی ہوجاتے ہیں اور جب تک ان کے ہاتھ میں عصا نہ ہو ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ یہ عادتیں اگرچہ بُری نہیں ہیں پھر بھی ان کی وجہ سے کبھی کبھی سخت مشکل محسوس ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ مقرر کسی چیز کی بھی عادت نہ ڈالے تاکہ وہ ہر حالت میں اور ہر موقع پر بے تکلف تقریر کرسکے۔

- پان کھا کر تقریر کرنے میں کسی قدر مشکل محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص ان لوگوں کو جو پیک تھوکنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر پان کھانا ضروری ہو تو ایسی تمیز سے کھانا چاہیے کہ نہ تو منہ سے پیک کی چھینٹیں اُڑیں اور نہ بار بار پیک تھوکنے کی ضرورت ہو۔

- تقریر کے شروع میں یا درمیان میں بار بار کھانسنا یا کھنکارنا سخت معیوب ہے۔

- رکیک اور عامیانہ باتیں کسی حالت میں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتیں اور ان کی وجہ سے مقرر کی حیثیت بہت گھٹ جاتی ہے۔ مہذب ظرافت تقریر میں جان ڈال دیتی ہے، مگر شرط یہی ہے کہ اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ مخالف کی دلیلوں کو بے اثر اور بے کار کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارآمد اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ نہایت سنجیدہ اور مہذب طریقے سے ان کا مذاق اُڑایا جائے۔

- دورانِ تقریر چھیڑے جانے پر یا بنائے جانے پر غصہ آجانے سے زیادہ مقرر کے لیے کوئی چیز نقصان دہ نہیں ہوسکتی۔ غصے کی حالت میں کوئی شخص معقول اور مربوط تقریر نہیں کرسکتا اور جو کچھ منہ میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ لوگ قہقہے لگائیں یا اُٹھ کر چلے جائیں۔

- بہت زیادہ آہستہ آہستہ اور سوچ سوچ کر تقریر کرنے سے بھی مجمع پر بُرا اثر پڑتا ہے اور مقرر کے متعلق یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ تقریر کرنی نہیں جانتا۔

- صاف، بلند اور اچھی آواز سے باوقار لہجے میں ایسی رفتار سے تقریر کرنی چاہیے کہ نہ اتنی تیز ہو کہ الفاظ سمجھ میں نہ آئیں اور نہ اتنی آہستہ کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ بچّے کیسے جا رہے ہیں۔

- ہمت و جرأت، وضع ولباس اور علم و عقل کے بعد جس چیز کی مقرر کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ دلی جوش ہے۔ ایسی تقریریں جو صرف زبانی ہوں اور جن سے خود مقرر کا اپنا دل متاثر نہ ہوا کثر بے نتیجہ اور بے اثر رہتی ہیں۔ ایک بہت ہی مشہور فارسی ضرب المثل ہے: ''ہر چہ از دل خیزد، بر دل ریزد'' یعنی جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل ہی میں جا کر بیٹھتی ہے۔ جن باتوں کا اثر خود مقرر کے دل پر نہیں ہے، انہیں وہ کبھی پورے جوش اور پورے زور کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا۔ جن باتوں سے مقرر خود متاثر ہے، ان کے بیان کرتے وقت وہ سرتا پا جوش بن جاتا ہے اور بجلی کی لہروں کی طرح اس کے الفاظ لوگوں کے دلوں میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

۸- کردار کی پاکیزگی:

جو کام مقرر خود کرتا ہو اس سے دوسروں کو روکنے کے لیے تقریر کرنا لا حاصل ہے۔ ہر ہر لفظ پر اس کا دل اس سے کہے گا کہ تو خود تو ایسا کرتا ہے۔ اس لیے ہر ہر لفظ پر اس کی زبان رُکے گی اور تقریر میں وہ ولولہ اور زور پیدا نہ ہو سکے گا جو اثر انگیزی کے لیے ضروری ہے۔ جن لوگوں کے ضمیر مجرم ہیں وہ کبھی اچھے مقرر نہیں بن سکتے۔ بے باکی اور بے خوفی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہے جن کے دامنوں پر جرم و گناہ کے دھبے پڑے ہوئے نہیں ہیں۔ بداطوار اور گنہگار کو تقریر کرتے برابر یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ حاضرین میں بہت سے لوگ اس

کی سیاہ کاریوں سے واقف ہیں، اس لیے ان سے اچھی طرح کھل کر تقریر نہیں کی جاتی۔ دنیا میں اگرچہ ایسے لوگ ضرور ہیں جو مجرم ضمیر رکھنے کے باوجود عوام کے سامنے آتے ہوئے نہیں شرماتے اور ہر قسم کی سیاہ کاریوں میں مبتلا رہنے کے باوجود برسرِ عام آ کر تقریر کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے ضمیر بالکل ہی مردہ ہو چکے ہیں اور اب جرم اور گناہ ان کے لیے اچھے کام بن گئے ہیں۔

- مقرر کی بُری شہرت بھی مقرر کی تقریر پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ جو لوگ عوام میں نیک نام ہیں ان کی تقریر اگر بھدی بھی ہو تو لوگ خوشی سے سن لیتے ہیں۔ جو لوگ پہلے سے بدنام ہیں ان کی بہتر سے بہتر تقریر پر بھی کوئی کان نہیں دھرتا۔

- عوام میں اچھی شہرت حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کر کے نہایت پاکبازانہ زندگی بسر کرے اور دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں خوش مزاجی اور ملنساری کے اصول پر عامل ہو۔ نیز رفاہ عامہ کے کاموں میں روپے پیسے سے، قلم سے، قدم سے غرض یہ کہ ہر طرح حصہ لیا کرے اور اخلاص، سرگرمی اور خوش دلی سے حصہ لیا کرے۔

حب الوطنی، قومی ہمدردی، انسانیت کی خیر خواہی اور فیاضی ایسی صفاتِ ہیں کہ انسان کو ہر شخص کی نگاہوں میں معزز بنا دیتی ہیں اور اس کی باتیں سننے کے لیے ہر کان نہایت خوشی اور احترام کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی آگ میں خود کود پڑنا، دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے خود تکلیف اُٹھانا اور دوسروں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا انسان کے اعلیٰ جوہر ہیں۔ ان کے آگے ہر سر تعظیم سے جھک جاتا ہے اور ہر دل ان کی جانب ایک مقناطیسی کشش کے ساتھ کھنچنے لگتا ہے۔ جو سب کے خیر خواہ ہوں ان کا بدخواہ کوئی نہیں ہوتا اور ایسے لوگ جو چاہیں کہیں اور جس طرح چاہیں کہیں، ان کی تقریر ہمیشہ شوق سے

سنی جائے گی اور اس کا ہر دل پر اثر ہوگا۔ نتیجہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر مقرر یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ کہے، اسے لوگ خوشی سے سن لیا کریں تو ایک مقرر کو اس کے سوا اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان اعلیٰ صفات سے اپنی ذات کو متصف کرلے۔ وہ چاہے ایک بہت اچھا مقرر نہ بن سکے، لیکن ایک کامیاب مقرر ضرور بن جائے گا۔

۹- تجربہ اور مشق:

ایک اچھا مقرر بننے کے لیے مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ تجربہ اور مشق کی بھی بہت ضرورت ہے۔ تجربہ تو ایسی چیز نہیں ہے جو کام کیے بغیر حاصل ہو جائے۔ وہ تو اسی وقت حاصل ہوگا جب داعی دعوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے گا۔ جب مقرر مختلف قسم کی محفلوں میں جا جا کر بیانات کرے گا۔ کہیں کامیاب ہوگا اور کہیں ناکام۔ کسی جگہ اس پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے جائیں گے اور کہیں ملامت کا ہار اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

مشق البتہ ایسی چیز ہے جو پہلے سے کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ آیئے! ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ مقرر کو کس کس چیز کی مشق کرنی چاہیے۔

- سب سے پہلے اس چال کی مشق ہونی چاہیے جس چال سے مقرر کو جلسہ کے اندر جانا چاہیے۔
- بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ بلا کسی قسم کے تصنع کے اظہار کے اسٹیج پر کھڑے ہونے کی مشق ہونی چاہیے۔
- اچھی صاف اور بلند آواز میں گفتگو کی مشق ہونی چاہیے۔
- حسبِ ضرورت چہرہ پر غم، خوشی، غصہ، نفرت اور جوش وغیرہ کی علامت پیدا کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔
- تقریر میں زور اور گرمی پیدا کرنے کے لیے موقع موقع سے ہاتھوں اور دیگر اعضا

کے اشاروں کی مشق کرنی چاہیے۔

- انتہائی رنج والم کے موقع پر آنکھ سے دو چار آنسو گرانے اور آواز کو بھاری بنا لینے کی مشق ہونی چاہیے۔

- متانت اور سنجیدگی کے ساتھ خوبصورت اور دلچسپ مذاق کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- خود مسکرائے بغیر اپنی باتوں سے دوسروں کو ہنسا دینے کی مشق ہونی چاہیے۔

- تقریر میں مناسب موقعوں پر چھوٹے چھوٹے چٹکلے اور لطیفے شامل کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- تھکن محسوس کیے بغیر مسلسل گھنٹہ دو گھنٹے تک تقریر کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- حسبِ موقع نہایت ہی سلیس یا نہایت ہی پُرشکوہ الفاظ استعمال کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- اپنے مطلب کو خوبصورت اور شاندار الفاظ میں ادا کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- حاضرین کی نگاہیں پہچاننے کی مشق ہونی چاہیے۔

- خطرے کے موقع پر مضبوط اور ثابت قدم رہنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- مخالف کی تقریر سے قابل گرفت باتیں چن لینے اور یاد رکھنے کی مشق ہونی چاہیے۔

- مخالف کی دلیلوں کو چٹکیوں میں اُڑانے کی مشق ہونی چاہیے۔

- دوسروں کے اعتراضات کو اور دوسروں کی تقریر کو اپنے مدعا کے مطابق بنا لینے کی مشق ہونی چاہیے۔

١٠ - ابتدا، وسط اور اختتام:

- شروع ہی سے اپنے ذہن میں تقریر کے تین حصے کر لینے چاہییں۔ پہلا حصہ تمہید، دوسرا حصہ اصل تقریر اور تیسرا حصہ اختتام۔

☆...... تمہید کی عمدگی پر تقریر کے اثر کا بہت کچھ دارومدار ہے۔

فرض کیجیے کہ حکومت کے کسی تشدد کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے کوئی سیاسی جلسہ منعقد ہوا ہے تو ہم صرف یہ کہہ کر بھی تقریر شروع کر سکتے ہیں: ''حضرات! آج آپ سب اس لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ حکومت کی فلاں کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔'' لیکن یہ روایتی اور فرسودہ الفاظ ہیں جن میں کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ اس کے بجائے اگر ہم اس طرح اپنی تقریر شروع کریں:

''میرے دُکھ درد کے شریک بھائیو! جنگل میں کبھی تم نے اس وقت کا تماشا بھی دیکھا ہے جب سیلاب آتا ہے اور گزوں اونچا پانی جنگل کی زمین پر کھڑا ہو جاتا ہے، اس وقت شیر اور بکریاں، ہرن اور چیتے سب اپنی اپنی جانیں لے کر بھاگتے ہیں اور کسی ایک اونچے ٹیلے پر جمع ہو جاتے ہیں۔ شیر کے برابر بکری کھڑی رہتی ہے اور چیتے کے کندھے سے کندھا ملائے ہرنیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ مشترکہ خوف سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھا دیتا ہے اور مشترکہ دُشمن سے محفوظ رہنے کی خاطر دوست اور دُشمن سب ایک جگہ آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ آج ہمارے جنگل میں بھی حکومت کے مظالم کا طوفان آیا ہوا ہے اور ہم سب بھی چاروں طرف سے بھاگ بھاگ کر اور آپس کے اختلافات بھلا کر اس ٹیلے پر جمع ہوئے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ......

اس طرح کی تمہید لوگوں کو تقریر سننے کے لیے بڑی حد تک تیار کر دے گی۔

☆...... کافی زوردار طریقہ پر تمہید اُٹھا کر مقرر کو چاہیے کہ بہت ہی سلیس، عام فہم اور بامحاورہ الفاظ میں اپنی اصل تقریر موزوں مثالوں اور خوبصورت چٹکلوں کے ذریعے سے اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کر دے۔ جس طرح تقریر کی غیر ضروری طوالت اس کا اثر کھو دیتی ہے اسی طرح نامناسب اختصار بھی نقصان دہ ہے۔ کافی صراحت و وضاحت کے

ساتھ فضول اور بے ربط طوالت دیے بغیر جو کچھ کہنا ہے وہ سب کچھ کہہ کر تقریر کو ایک نہایت ہی دلکش انداز میں خاتمہ کی طرف لانا چاہیے۔

☆...... ایک پُر جوش اور پُر زور تقریر کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا انجام اور اختتام یکا یک اور اچانک نہ ہو۔ بعض مقرر اپنے مدعا کا اظہار کر چکنے کے بعد بالکل خلافِ توقع یکا یک یہ کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں: ''بس مجھے اسی قدر کہنا تھا'' اور تقریر کسی قدر تشنہ سی رہ جاتی ہے۔

- مقرر کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اس بات کا صحیح اندازہ کر سکے کہ اسے کب اپنی تقریر ختم کر دینی چاہیے؟ لمبی تقریروں سے مجمع اکثر اُکتا جاتا ہے، اس لیے جس وقت ایسا معلوم ہو کہ سامعین کچھ تھک چکے ہیں، اسی وقت ایک مناسب اور خوبصورت طریقہ پر تقریر کو ختم کر دینا چاہیے۔

- جس طرح تمہید پر تقریر کا اثر موقوف ہوتا ہے اور جس طرح تمہید لوگوں کو تقریر سننے کے لیے آمادہ بلکہ بے تاب بنا دیتی ہے، اسی طرح تقریر کا اختتام بھی لوگوں کو تقریر کا مفہوم اور مطلب یاد رکھنے میں مدد دیتا ہے اور اگر تقریر کا اختتام اچھا ہوا ہے تو لوگ جلسہ کی واپسی پر آپس میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے جاتے ہیں اور اس طرح تقریر کا مفہوم انہیں اچھی طرح یاد ہو جاتا ہے۔

- بعض مقرر تقریر ختم کرتے وقت اپنی تمام تقریر کا خلاصہ ایک مرتبہ پھر دہرا دیتے ہیں۔ اس طرح دہرانا صرف اسی صورت میں اچھا ہو سکتا ہے کہ جب اس قدر عمدگی سے عمل میں آئے کہ لوگ اسے دہرانا نہ خیال کریں۔ تقریر کو اگر یہ ظاہر کر کے دہرایا جائے کہ وہ دہرائی جا رہی ہے تو سامعین کے لیے اس میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا اور وہ اس سے کسی قدر بددل ہو جاتے ہیں۔

- ایک مذہبی تقریر کا اختتام حاضرین سے کوئی وعدہ لینے پر، دعا پر یا کسی اچھے شعر پر کیا جا سکتا ہے۔

- ایک سیاسی تقریر کا اختتام کسی نہایت پُر جوش فقرہ پر مثلاً یہ کہ: ''حضرات باتیں بہت کچھ بتائی جا چکیں اور تقریریں آپ نے بہت سی سن لیں۔ اگر آپ میں کچھ ہمت ہے تو اُٹھیے اور کام کیجیے۔'' یا یہ کہ ''حضرات! اب تو آپ مجھ سے بھی زیادہ اچھی طرح اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ زندگی درحقیقت اپنے وطن اور اپنی قوم کے لیے مرجانے کا نام ہے۔ جب تک دانے خاک میں نہیں ملتے، اس وقت تک پھولوں کو بہار کہاں نصیب ہوتی ہے؟ اب میں آپ کا وقت باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا، آپ جوش میں بھرے ہوئے ہیں اور آپ اب کچھ کام کرنا چاہتے ہیں اس لیے اجازت چاہتا ہوں......'' وغیرہ۔

- علم وفن کے متعلق جو تقریریں ہوتی ہیں ان کا مقصود جوش دلانا یا کوئی خاص اثر پیدا کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی علمی مسئلہ کے متعلق اپنی رائے یا اپنی تحقیق کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے انہیں تو جیومیٹری کی شکلوں کی طرح یہی کہہ کر ختم کر دینا چاہیے: ''اور یہی مجھے ثابت کرنا تھا۔''

۱۱- آخری بات:

جو لوگ قدرت سے خطابت کی اچھی استعداد لے کر آئے ہیں انہیں تو کسی مشق کی ضرورت ہے اور نہ کسی تربیت یا رہنمائی کی، لیکن جو لوگ کہ اسے فن کے طور پر سیکھ کر مقرر بننا چاہتے ہیں، ان کے لیے بہترین طریق کار یہی ہے کہ وہ ایک مختصر سی انجمن قائم کر لیں۔ جہاں سب لوگ تقریریں، مباحثے اور مناظرے کیا کریں۔ مشق کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ان انجمنوں میں جو تقریریں کی جاتی ہیں ان میں خطابت کے تمام قواعد کی پوری پوری پابندی کر کے اپنے آپ کو عادی بنا لینا چاہیے۔ نیز یہ کہ آہستہ آہستہ اس مختصر حلقہ کو وسیع کرتے رہنا چاہیے اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اس انجمن کے رکن نہیں ہیں انہیں

اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے اور ان کے سامنے تقریریں کی جائیں۔ جب خوب مشق ہو جائے تو پھر عام مجمع میں تقریر کرنے میں حرج نہیں۔

اس غرض کے لیے مدرسے میں ہر درجے کی ایک انجمن قائم کرلی جائے اور اس میں ہر آٹھویں یا پندرہویں روز مختلف عنوانات پر تقریر ہوا کرے۔ اگر ممکن ہو تو کسی ایک ماہرِ فن یا مبصر کو بھی اس انجمن میں شریک کرلیا جایا کرے جو انجمن کے اختتام پر ہر ایک مقرر کو اس کی خامیوں سے اور اس کے نقائص سے آگاہ کر دیا کرے۔ اگر کسی ماہر کی خدمات دستیاب نہ ہوں تو انجمن کے نگران استاد صاحب یا پھر صدر یا سیکریٹری اس چارٹ سے مدد لے جو اس کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ اس سے ان شاء اللہ کسی ماہر کے بغیر خود ہی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہی اور ان کی اصلاح ہو جایا کرے گی۔ شرط یہ ہے کہ انجمن کے اختتام پر اس چارٹ کو بورڈ پر لگایا جائے اور اگلی مرتبہ ہر طالب علم یا رکن کو وہ خامیاں دور کرنے کا پابند کیا جائے جو اس نے پچھلی مرتبہ کی تھیں۔

تقریر سیکھنے والے کے لیے چالیس ہدایات

۱- آواز کو صاف رکھو! جاندار بناؤ! اور اس طرح بناؤ کہ مترنم محسوس ہو۔ یعنی اس میں ایک طرح کی نغمگی ہو، کھردرا پن نہ ہو۔ آواز ذریعۂ ابلاغ ہے۔ گلا صاف ہوگا تو آواز ستھری ہوگی۔ ایک طاقتور آواز ہی فتح مند ہو سکتی ہے۔

۲- آواز کو بے عیب رکھنے کے لیے اُن چیزوں کے کھانے پینے سے پرہیز کیجیے جن سے آواز خراب ہوتی اور اس میں جھول پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ اچار زیادہ کھاتے یا تمباکو پیتے ہیں اُن کی آواز داغدار ہو جاتی ہے۔ اس طرح دوسرے نشے بھی آواز میں دراڑیں پیدا کر دیتے ہیں۔

۳- کبھی چبا کر نہ بولیے! الفاظ نوالہ نہیں۔ اس طرح بولیے کہ حلق سے نکلی، حلق میں پہنچی۔

٤- آواز میں چمک ہو۔ خطیب اس کے اُتار چڑھاؤ سے آشنا ہو۔ پہلے گونج اور گرج سیکھی جاتی ہے پھر آواز کا اتار چڑھاؤ خطابت کا فطری لازمہ ہو جاتا ہے۔

۵- آواز کی تربیت اور اس کی ترتیب سے نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ہم دوستانہ صحبتوں، عالمانہ محفلوں اور ادیبانہ حلقوں میں گفتگو سے آواز کی تربیت کر سکتے اور اُس کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ خطباء و ادباء، شعراء اور علماء و فضلاء کی بات چیت پر نگاہ رکھیے۔

٦- آپ جس موضوع، عنوان یا مضمون پر تقریر کرنا چاہتے ہیں، اُس کی تیاری ضرور کیجیے۔ کسی کاغذ کے پُرزے پر اشاراتی نوٹ لینا عیب نہیں۔ ذہنی تیاری ضرور کیجیے۔ تیاری وزن بڑھاتی ہے۔ جو کچھ آپ کے ذہن میں ہوتا ہے اُس میں اضافے کا ذریعہ اور زبان و بیان میں تسلسل و آرائش کا باعث بن جاتی ہے۔

۷- ہر وہ کتاب جو مطالعہ کے لیے آپ منتخب کرتے ہیں اور اس کے مصنف و موضوع یا مؤلف و مضمون کے متعلق آپ کو اعتماد ہے تو اس کی خاص باتوں کو نشان زد کیجیے اور اس کے نوٹ ضرور لیجیے۔ اس غرض سے ایک کاپی رکھیے۔ اس کاپی کے مندرجات اور خوبصورت جملوں کو دہراتے رہیے تاکہ حافظہ کا حصہ ہو جائیں اور دماغ انہیں محفوظ کرے۔ زیرِ مطالعہ کتاب کے شروع و آخر میں خالی صفحات پر یادداشتیں لکھنا بھی مفید رہتا ہے۔

۸- جس موضوع یا مضمون پر تیاری کریں اس کے عمومی دلائل کو اپنے لہجے میں بیان کریں لیکن اصل خوبی یہ ہے کہ اپنے موضوع و مضمون کے لیے کوئی نئی بات ضرور پیدا کریں۔

۹- ایسے کسی موضوع پر کبھی نہ بولیں جس سے آپ کو دلچسپی نہیں یا جس کے بارے میں آپ کو علم نہیں۔ محض زبان دانی یا زبانی جمع خرچ سے آپ کسی موضوع یا مضمون پر قادر نہیں ہو سکتے۔

۱۰- سب سے اہم چیز یہ ہے کہ آپ تقریر کیسے شروع کریں؟ یاد رکھیے! ہر تقریر کا ابتدائیہ ہی سامعین کو متوجہ کرتا ہے۔ ابتدائیہ کے بول اس طرح اٹھایئے کہ اس کے الفاظ عوام کے سینہ میں اس طرح کُھب جائیں جس طرح شاعروں کے دل میں سرمئی نگاہیں ترازو ہو جاتی ہیں۔ آپ اسٹیج پر کھڑے ہوئے اس طرح معلوم ہوں کہ آپ کو خود پر اعتماد ہے۔ آپ اپنے دل کی بات دوسروں کے دل میں اُتارنے کے لیے پُر جوش ہیں اور عوام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم کلام ہونا چاہتے ہیں۔

۱۱- ابتدا ہی میں گرج گونج پیدا نہ کیجیے، نہ آواز میں خروش و جوش لایئے۔ ملائمت وسلاست سے چلیے۔ جب لوگ ہمہ تن گوش ہو جائیں تو اظہار و اسلوب کے زاویے اپنا راستہ خود بنائیں گے۔ آپ کے ذہن میں یہ احساس رہنا چاہیے کہ آپ لوگوں کو نہ تو فریب دینے کے لیے آئے ہیں اور نہ انہیں مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصد ان کے دماغوں

تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

۱۲- ہمیشہ اور ہر جگہ تقریر کا ابتدائیہ اُس وقت کے رواں دواں خیالات کے مطابق رکھیے۔ اس سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں، مثلاً عوام کی توجہ اور طبائع کی شگفتگی۔ اس سے خیالات کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔

۱۳- ہر مقرر کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ پہلی جست ہی میں عوام کو اس طرح اپنے ہاتھ میں لے کہ وہ اُسی کے ہو جائیں اور محسوس کریں کہ اُن کے دامن میں کوئی چیز ڈالی جا رہی ہے۔ وہ کچھ حاصل کرنے کے لیے آئے اور حاصل کر رہے ہیں۔

۱٤- آپ مجمع کو اُس وقت تک کسی بات پر آمادہ نہ کریں یا عمل کی دعوت نہ دیں، جب تک اُس کو وحدت میں ڈھال کر اپنی مٹھی میں نہ کر لیں۔ عوام کبھی ایک نہیں ہوتے، انہیں ایک کرنا ہی مقرر کا سب سے بڑا کمال ہے۔

۱۵- ہمیشہ دوستانہ طریقے سے خطاب کریں۔ کبھی اجنبی انداز یا روکھے لہجے میں نہ بولیں۔ اس غرض سے ایسا کوئی پہلو ضرور تلاش کریں جو آپ کے اور عوام کے درمیان مشترک ہے۔

۱٦- اگر کوئی مقرر آپ سے پہلے اپنے خیالات کی چھاپ لگا چکا ہے اور حاضرین اس سے متاثر ہوئے ہیں تو اپنی تقریر کا آغاز اُس کے اختتام یا خلاصۂ کلام سے ملا کر اس طرح کیجیے، گویا آپ اُس کی کہی ہوئی بات کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

۱۷- ہر موضوع کے حقائق ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ان کے بغیر خطابت میں طاقت پیدا نہیں ہوتی اور نہ عوام ذہنی طور پر کچھ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے سامنے حقائق کو اس طرح پیش کیجیے کہ ان کے دل میں اُترتے جائیں۔

۱۸- خطابت عوام کی عقلیں سلب کرنے کا نام نہیں، ان کی عقلوں کو اجالنے کا فن

ہے۔ حقائق کو اس طرح ترتیب دیجیے کہ موتیوں کی لڑیاں معلوم ہوں۔ عوام اُنہیں پھولوں کی طرح چُن لیں اور اُن سے سماعت کا ہار پروئیں۔ جب حقائق اظہار و اسلوب کے تنوع سے خطابت کے اُتار چڑھاؤ کے ذریعے اپنی معراج کو پہنچتے ہیں تو وہ خطیب کی ذہنی فتح مندی کا ایک موڑ ہوتا ہے۔ اس منزل کو ''ملہمانہ مقام'' کہتے ہیں۔ یہی چیز شاعری میں ''بیت الغزل'' کہلاتی ہے۔

۱۹- لہجے کا زور اور بلندی، تقریر کی ایک معراج ہے۔ اس سے کوئی تقریر خالی نہیں ہوتی، لیکن موضوع اور تقریب کی رعایت سے اتار چڑھاؤ کا تناسب ہوتا ہے، اس لیے خواہ مخواہ خطابت میں تموّج پیدا نہ کیجیے۔ مصنوعی مدوجزر اور اختیاری گونج گرج کی مثال اس طرح ہے گویا کوئی با بےسُر بانسری بجا رہا ہے۔

۲۰- خطابت میں قدرت تامہ حاصل کیے بغیر ایسی بات نہ کہیے جس سے ٹکراؤ پیدا ہوتا، ذہن متصادم ہوتے اور فضا متحارب ہوتی ہے۔ خطابت کا اصل حسن یہ ہے کہ زہر کو بھی اس طرح پیش کریں کہ وہ سماعت و فکر کے لیے شیریں ہو۔

۲۱- بعض مقرر سامعین کی ذہنی فضا کا لحاظ نہیں کرتے اور اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ اس طرح تقریر کامیاب نہیں ہوتی۔ اگر لوگ سُن بھی لیں تو اس کا سبب تقریر کی دل کشی نہیں بلکہ کوئی دوسری وجہ ہے۔ مثلاً مقرر کی شخصیت، جلسہ کا احترام، یا عوام کا رکھ رکھاؤ۔ اس قسم کی تقریریں مختصر ہوتی ہیں، طویل کبھی نہیں ہوتیں۔ حاضرین کئی طرح کی آوازوں یا قہقہوں سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے ہیں۔

۲۲- ہر ذہین خطیب کو اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کی داد کیا ہے، تحسین کیا ہے اور حوصلہ افزائی کیا ہے؟ اور یہ کہ جب عوام کسی مقرر سے اُکتا جاتے ہیں تو کیونکر اُس کی تضحیک کرتے ہیں؟ تب جزاک اللہ یا سبحان اللہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ایک اچھا مقرر تعریف تضحیک کے

اشارات وکلمات کوفوراً بھانپ لیتا ہے۔

۲۳- خطیب کی خوبی یہ ہے کہ اپنے سامعین میں اُکتاہٹ پیدا نہ ہونے دے اور جب اکتاہٹ پیدا ہونے لگے تو اپنے بیان میں اس طرح شگفتگی پیدا کرے کہ ان کے چہرے کھل جائیں اوران کی توجہ اُبھر آئے۔یہی خطابت کا کمال ہے۔

۲۴- غیر ضروری لطائف، بوجھل حکایتیں اور بے ربط چٹکیاں، خطابت کے فطری حسن کو مجروح کرتی ہیں۔اُن سے سماعت کی یکجہتی میں دراڑ پیدا ہوتی ہے اور خطابت میں توازن نہیں رہتا۔لطائف سے فائدہ اٹھائیے۔حکایت، خطابت کی ہمجولی ہے اور طنز وپھبتی کے ذریعے نہایت عمدگی سے چٹکی لی جاسکتی ہے،لیکن تقریر ان کا ملغوبہ نہیں ہونی چاہیے۔ان کی حیثیت خطابت کے دریامیں کناروں کے پاس سے گزرتی ہوئی لہر کی سی ہے۔

۲۵- خطابت کے لیے خشک پن مہلک ہے۔خشک لہجہ اور روکھا چہرہ کبھی مؤثر نہیں ہوتے اور نہ ان سے ذہنی تربیت اور فکر سازی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ایک باغ و بہار طبیعت ہی باغ و بہار فضا پیدا کرسکتی ہے۔لطائف اور تمثیلات، خطابت کا لازمہ ہیں۔ان میں عوام کے لیے ایک ذائقہ ہے اور وہ ان سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ان کی مثال کھانے کے ساتھ چٹنی اور شیرینی کی ہے۔

۲۶- زبان سیکھتے رہیے! زبان سب سے بڑی دولت ہے۔جس طرح اندھا بتا نہیں سکتا کہ اس کے گرد وپیش کیا ہے؟ اس طرح زبان سے محروم انسان اپنے خیالات پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ایک بے زبان صاحبِ علم،علم کا مزار ہے۔زبان ہمیشہ سیکھیے ، ہر لحہ سیکھیے اور آخر تک سیکھیے ۔کیونکہ زبان انسانوں کی طرح بڑھتی ، پھولتی اور پھیلتی ہے اور الفاظ نسلِ انسانی کے مانند پیدا ہوتے ، پھر اپنے مختلف دور گزار کر جوان ہوتے ہیں۔

۲۷- کسی مقرر کے طرز (سٹائل) کی نقل نہ کیجیے اور نہ یہ کوشش کیجیے کہ وہ نقل آپ کی اصل

ہو جائے۔ اصل اصل ہے، ''کاربن کاپی'' بننے سے کچھ فائدہ نہیں۔ دوسروں کی خوبیوں سے فائدہ ضرور اٹھاؤ! ان کے اظہار و اسلوب اور بیان و زبان سے اپنی انفرادیت کے لیے مواد اخذ کرو! ایک نامور مقرر کی تکنیک کا مطالعہ خود ایک تکنیک پیدا کرتا ہے لیکن اس کا چربہ اُتارنا، فنی کمال کے لیے مفید نہیں۔ ناقل بہر حال ناقل ہی رہتے ہیں اور اُن کا شعلہ جلد ہی بجھ جاتا ہے۔

کئی لوگوں نے مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ کی نقل کرنا چاہی لیکن کہیں نہ کہیں اُن کا شعلۂ گفتار ماند پڑ گیا۔ ابوالکلام، ابوالکلام ہی رہے اور محمد علی، محمد علی ہی رہے۔ ایک دوسرے کی جگہ نہ لے سکے۔ دونوں اپنے فن میں کامل تھے۔ مثلاً جوش و جگر، دونوں ہم عصر شاعر تھے لیکن نہ جگر جوش کی جگہ لے سکے اور نہ جوش جگر کو پہنچ سکے۔ احسان دانش، اختر شیرانی نہ ہو سکے اور اختر شیرانی، احسان دانش نہ بن سکے۔ کمال دونوں کے پاس رہا۔ بہ قول سعدی ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

۲۸- ان خطبا کی ہو بہو نقل محال ہے جو خطابت کی رعنائی کے ساتھ، علم کی گہرائی رکھتے تھے اور قدرت نے انہیں ملکۂ وہبی دے رکھا تھا۔ چہروں کا حُسن اور آنکھوں کی مستی کے متعلق معلوم ہے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن ہر چہرے اور ہر آنکھ میں حُسن و مستی کی چھاپ مختلف ہوتی ہے اور اسی کا نام حسن کی انفرادیت ہے۔ فی الجملہ حسن و مستی دلربائی کا خزینہ ہیں۔ تمام کائنات ان سے بھرپور ہے، لیکن حسن و مستی کسی کتاب یا اخبار کی طرح نہیں کہ ہر روز کا اخبار یکساں ہوگا اور کتاب کا ہر نسخہ ایک سا ہوگا۔ ہر چہرے کے ساتھ حسن و مستی منفرد ہوتی ہے۔ اسی طرح زبان و بیان کی رنگا رنگی کا نام خطابت ہے۔

۲۹- بعض لوگ ایک طرز پکا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی پکوان زبان کی لذت قائم نہیں رکھ سکتا۔ بعض لوگ ریاضی کی طرح خشک اور منطق کی طرح پیچ دار ہوتے ہیں۔

کچھ جذباتی انداز کا سہارا لیتے اور کئی غضب ناک لہجہ یا رعب بھری آواز میں گتھے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض اجزا خطابت کے بنیادی لوازمات میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور موضوع و محل کی رعایت سے ان کی ضرورت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، لیکن خطابت کسی خاص طرز یا کسی واحد ادا کا نام نہیں۔ خطابت، وجدان کی مختلف لہروں اور مختلف المعنی جذبات واحساسات کا مجموعہ ہے۔

۳۰- سامعین کو اس طرح خطاب کیجیے گویا وہ آپ کی طاقت ہیں اور آپ اُن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ مجمع سادہ ذہن اور سادہ دل ہو کر آتا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ وہ کچھ نہیں۔ وہ سب کچھ ہیں لیکن آپ انہیں کیا دے سکتے ہیں؟ یہ اصل سوال ہے۔

۳۱- ایک مقرر کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ عوام کی نفسیات کیا ہیں؟ وہی مقرر کامیاب ہو سکتا ہے جو عوام کی نفسیات جانتا اور انسانی طبیعتوں کی رنگا رنگیوں سے واقف ہوتا ہے۔ ہر وہ انسان جو حاضرین میں موجود ہے، آپ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہے۔ ہر شخص کچھ چاہتا ہے، اُس کی کوئی ضرورت ہے، وہ محسوس کرتا ہے، اُس کی پسند و ناپسند ہے۔ بعض چیزوں سے محبت کرتا، بعض سے نفرت کرتا ہے۔ اُس کے کچھ خوف ہیں۔ کچھ جرأتیں ہیں۔ اُس کے کچھ اعتقادات ہیں۔ کچھ تصوّرات ہیں۔ اس کا میلان و رجحان ہے۔ اس کا شعور ولاشعور ہے۔ ہر انسان کا مطالعہ بحیثیت انسان، ایک خطیب کا لازمہ ہے۔ آپ مخصوص اشارات اور بدیہی اسلوب ہی سے عوام پر قابو پا سکتے ہیں لیکن کوئی چیز مصنوعی نہ ہو۔ یوں سمجھیے کہ آپ بہت سی چیزیں سامعین وحاضرین کے حافظہ کی لوح پر اُجال رہے ہیں اور بہت سی چیزیں اُن کے دل سے کُرید کر انہیں یہ احساس دلا رہے ہیں کہ آپ اُنہی کی سرگزشت بیان کر رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتے تھے لیکن کہہ نہیں سکتے تھے۔ آپ نے ان کے خوابیدہ احساسات کو جگا کر متحرک کرنا ہے۔ کمال خطابت یہی ہے کہ آپ انہیں پلک جھپکتے میں پہاڑوں پر لے

جاتے،فضاؤں میں پھراتے اور باغوں کی سیر کرانے لگتے ہیں۔

۳۲- ہمیشہ دوست کی حیثیت سے خطاب کیجیے اور عوام کو یہ تاثر کبھی نہ دیجیے کہ آپ اُن سے الگ انسان ہیں یا اُن سے برتر کوئی چیز ہیں۔آپ اُن کے لیے حاکم نہیں،ان کے ہمسفر ہیں۔وہ خود محسوس کریں کہ آپ اُن کے قافلے کے سالار ہیں۔

۳۳- اعتراض کرنے والے کو نفرت سے نہیں،محبت سے جواب دیں اور وہ جواب مسکت و مدلل ہو لیکن اعتراض کی نوعیت کے پیش نظر جواب کی شیرینی و تلخی ضرور ہو۔بسا اوقات کچھ لوگ خرابی و خلل پیدا کرنے کے لیے اعتراض کرتے ہیں۔اُن پر حاضر کلامی و برجستہ گوئی کے ترکش سے نشتر چھوڑنا،سرجن کے آپریشن کی طرح کام کرتا ہے۔کسی شریر الطبع معترض کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں بلکہ ایسی خوش طبعی کے ساتھ اُسے چت کریں کہ وہ خود محسوس کرے کہ پٹخنی کھا گیا ہے۔

۳۴- تحریر ہو یا تقریر،تکرار عیب ہے،لہٰذا آپ کسی نظریے یا مقصد کو عوام کے ذہنوں میں اُتارنا چاہتے ہیں تو مترادف الفاظ استعمال کر کے مکرر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

۳۵- جب مجمع بہت بڑا ہو تو آپ استدلال سے کہیں بڑھ کر جذبات سے کام لیں اور اپنے ذہن میں یہ بات نقش رکھیں کہ عوام جذبات کی مخلوق ہیں۔وہ استدلال کے نہیں جذبے کے شیدائی ہوتے ہیں۔دنیا کو اصولوں نے اس قدر اُلٹ پلٹ نہیں کیا جتنا شخصیتوں نے ہلایا ہے۔جب کسی تحریک کا زمانہ ہو تو عوام توے پر اچھلتے دانے کی طرح ہوتے ہیں۔وہ دماغ کے بجائے دل کی مخلوق ہوتے اور استدلال کی بہ نسبت جذبوں کی پکڑ میں رہتے ہیں،لیکن دلوں سے کھیلیے نہیں،دلوں کو اُجالیے کہ خطابت میں دلوں سے کلام کیا جاتا ہے۔

۳۶- علماء و فضلا اور شعرا و ادبا پر نگاہ رکھیے کہ وہ کس لفظ کا استعمال کس طرح کرتے ہیں؟ ہر لفظ ہر جگہ کے لیے نہیں اور نہ الفاظ کے بے جا استعمال کا نام فصاحت و بلاغت ہے۔

۳۷- صبح کی ہوا صحت کے لیے اور صبح کا اخبار خطابت کے لیے لازم ہے۔ آج کا انسان اخباری مطالعہ کے بغیر گھپ اندھیروں میں کھو جاتا ہے۔ موجودہ دور کا انسان علاقائی شہریت کے باوجود ذہنی اعتبار سے عالمی ہو چکا ہے، لہٰذا ملکی و عالمی حالات اور ان کے رخ کا ادراک رکھیے!

۳۸- مقرر کے لیے سب سے بڑی نعمت اُس کا حافظہ ہے۔ حافظہ کا تعلق صحت کے ساتھ ہے۔ حافظہ کو مضبوط کرنے کے لیے ہر وہ چیز استعمال کیجیے جس سے اس کو تقویت ملتی ہے۔

۳۹- کبھی اس قسم کے پُرشکوہ الفاظ یا استعارے اور تشبیہیں استعمال نہ کیجیے جو عوام کی ذہنی استعداد سے اونچے ہوں۔ ان استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیں جو زبان سے نکلتے ہی عوام کے دماغ پر دستک دیں اور وہ ایسا لطف محسوس کریں کہ آپ انہیں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ ہمیشہ یہ چیز سامنے رکھیے کہ جلسہ عام میں آپ خواص سے نہیں، عوام سے مخاطب ہیں۔ عوام کی اکثریت کو خواص کی اقلیت پر قربان کرنے سے آپ نہ تو اپنا نقش جما سکتے ہیں اور نہ حصولِ مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، کیوں کہ عوام و خواص کے ذہنی میدان مختلف ہیں۔

۴۰- بسا اوقات اپنے سے برتر خطیب اور بلند تر شخصیت کا غیر شعوری رعب و دبدبہ آپ کو لاشعوری طور پر اس طرح مرعوب کرتا ہے کہ آپ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک طبعی امر ہے۔ ہر مقرر کو اس حالت سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن اس پر قابو پانا مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ آسان بھی ہے! اگر آپ کے پاس اپنے موضوع کے متعلق معلومات کا سرمایہ ہے اور آپ خطابت کے اصول و قواعد سے واقف ہیں تو آپ خود اعتمادی سے اس حالت پر قابو پا سکتے ہیں اور اس خوف کو گرد کی طرح جھاڑ سکتے ہیں۔ جب اجتماع اس انداز کا ہو تو اپنے موضوع کی مکمل تیاری کے بعد خطاب کریں۔ آپ کے ابتدائیہ پر عوام کی تحسین آپ کے ذہن کو جگمگا دے گی اور آپ کا ذہنی راستہ کُھل جائے گا۔

تقریر سیکھنے والے کے لیے سو مشورے

آخر میں تقریر کرنے والے کے لیے سو اہم مشورے درج کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مشورے مکرر معلوم ہوں گے لیکن یہ مقرر کے لیے انتہائی کارآمد اور اس کی ترقی کے لیے بہت مفید ہیں۔

۱- ایک وجیہہ آدمی کے لیے ایک بدشکل آدمی کے مقابلے میں کامیاب مقرر بننے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ اونچے قد کے آدمی چھوٹے قد والے لوگوں کی بہ نسبت اپنی تقریر کا زیادہ اثر پیدا کر لیتے ہیں۔ بھاری بھرکم جسم سے سامعین اکثر مرعوب ہو جاتے ہیں، لیکن جسم کا غیر معمولی طور پر موٹا ہونا جسے دیکھ کر ہنسی آئے، ایک مقرر کے لیے بہت ہی مضر چیز ہے۔

۲- مقرر کے چہرے یا جسم میں کوئی ایسا عیب جو مضحکہ خیز ہو، سامعین پر اس کی تقریر کا اثر نہیں ہونے دیتا اور ایسے لوگوں کو مقرر بننے کی کوشش صرف اسی صورت میں کرنی چاہیے جب ان کی زبان میں غیر معمولی اثر ہو۔

۳- مقرر کی آواز صاف، شیریں اور خوب بلند ہونی چاہیے۔ اگرچہ بعض ایسے مقرر بھی شہرت حاصل کر چکے ہیں جن کی آواز بہت پست تھی، لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کا غیر معمولی اثر انگیز زورِ بیان تھا۔

٤- مقرر کی تمام جسمانی حرکات سے ایک شان ظاہر ہونی چاہیے۔ دورانِ تقریر اکثر مقرر ہاتھوں سے بعض اشارے بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ اشارے تقریر میں جان سی ڈال دیتے ہیں، لیکن یہی اشارے اگر بھدے ہوں تو لوگوں کو ان پر ہنسی آنے لگتی

ہے اور مقرر کی کسی بات پر لوگوں کو ہنسی آنا تقریر کی ناکامی کا دوسرا نام ہے۔

۵- مقرر کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے مکمل بے خوفی اور خوداعتمادی ظاہر ہو۔ اس کی وضع قطع ایسی ہونی چاہیے جس سے رعب اور شان ظاہر ہوتی ہو۔ مسنون لباس جیسے عمامہ، جبہ اور عصا مقرر کی شان کو بہت بڑھا دیتے ہیں۔ میلا کچیلا لباس، بدنما کپڑے یا آوارہ اور لچر لوگوں کے طرز کا لباس ایک مقرر کے لیے بدترین چیزیں ہیں۔ ایسا لباس بھی مقرر کے لیے موزوں نہیں ہے جس سے بہت زیادہ نمود اور نمائش ٹپکتی ہو۔ مقرر کے دانت بالکل صاف ہونے چاہییں۔ میلے دانت اگر سامعین کو نظر آجاتے ہیں یا منہ کی بُو ان تک پہنچ جاتی ہے تو انہیں مقرر سے نفرت سی ہو جاتی ہے اور پھر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ الغرض مقرر کی صورت میں یا اس کے حلیے اور لباس میں کوئی چیز ایسی نہ ہونی چاہیے جس سے لوگوں کو کراہت یا نفرت پیدا ہو جائے یا جس پر لوگوں کو خواہ مخواہ ہنسی آجائے۔

٦- تقریر کرنے کے لیے سب سے اہم چیز حوصلہ اور بے خوفی ہے۔ مجمع کے سامنے جاتے وقت پریشانی یا بدحواسی ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ حوصلہ پیدا کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ مقرر بیان کو اللہ کا حکم سمجھ کر پورا کرے اور اللہ کا حکم پورا کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد پر کامل یقین رکھے۔ نیز ایک ترکیب یہ ہے کہ وہ دل میں اس بات کا یقین رکھے کہ اس کی گفتگو سننے والوں میں کوئی اس سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔

۷- جس موضوع پر تقریر کرنی ہے اس کے متعلق تمام باتیں پہلے اچھی طرح سوچ کر ترتیب دے لینی چاہییں۔ تقریر یا اس کے مرتب خلاصے کو پہلے سے لکھ کر دہراتے رہنا بہت کام دیتا ہے۔ خاص کر ایسے آدمیوں کو جو مجمع کے سامنے جانے سے گھبرا جاتے ہوں۔

۸- تقریر اگر پہلے سے لکھ لی گئی ہو تو یاد کرنے کے علاوہ یہ بھی مناسب ہے کہ اپنے چند دوستوں کے سامنے اسے آداب کی رعایت رکھتے ہوئے دہرا لیا جائے۔

۹- جو بات دوسروں کو سمجھانی ہے، جو خیالات یا جو اصول عوام کے سامنے پیش کرنے ہیں، ان پر مقرر کو خود عمل کرنا چاہیے ورنہ اس کی تقریر بے اثر رہے گی۔

۱۰- اپنی کامیابی کے متعلق مقرر کے دل میں ذرا سا بھی شک نہیں آنا چاہیے۔ شک پیدا ہوتے ہی وہ تمام خیالات جن کا اظہار کرنا مقصود تھا، دل سے نکل جاتے ہیں اور مقرر کی زبان رُک جاتی ہے۔ اللہ پر یقین اور اس کے دین کی خدمت کرنے والے کے لیے اس کی نصرت کا یقین خطیب کے دل میں راسخ ہونا چاہیے۔

۱۱- مقرر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی علم سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ جن علوم کی ایک مقرر کو بہت زیادہ ضرورت پڑا کرتی ہے وہ یہ ہیں: مذہبی احکام، اپنی قوم کی اور دوسری قوموں کی تاریخ، اپنے ملک کا اور دوسرے ملکوں کا جغرافیہ، اپنی زبان کا ادب، اس کے علاوہ سائنس، طب اور منطق کے موٹے موٹے اصول۔

۱۲- زبان سے تقریر کی مشق کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہاتھوں کی اور جسم کی بعض حرکات کی بھی خوب مشق کر لی جائے۔ اس کا آسان اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ آئینہ سامنے رکھ کر ہاتھوں وغیرہ کی حرکت اور اشاروں کی خوب اچھی مشق کر لی جائے تاکہ سامعین کے سامنے بالکل صحیح اشارے کیے جا سکیں۔

۱۳- اچھا مقرر بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اچھے اچھے مقرروں کی تقریروں کو خوب غور سے سنا جائے اور ان میں جو باتیں لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالنے والی معلوم ہوں، انہیں اپنے حافظہ یا نوٹ بک میں محفوظ کر لیا جائے۔

۱۴- ضرب الامثال اور چھوٹے چھوٹے لطیفوں کا استعمال بسا اوقات تقریر کے زور کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مقرر کو بہت سے لطیفے اور کہاوتیں یاد ہوں اور ان کو موزوں انداز سے بیان کرنے کی مشق ہو۔

۱۵- بڑے بڑے مشہور لوگوں کے مقولے اپنی بات کے ثبوت میں پیش کرنے سے بھی زورِ تقریر بڑھ جاتا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ مقرر اس قسم کے بہت سے اقوال اپنے حافظہ میں محفوظ رکھے اور انہیں موقع کی مناسبت سے استعمال کرے۔

۱۶- مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ملک کی علمی اور تاریخی شخصیات کے حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہو اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی تقریر میں ان کے حالات کا اور ان کے خیالات کا حوالہ دے سکے۔

۱۷- دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی سوانح عمری بھی مقرر کو یاد ہونی چاہیے تاکہ ضرورت کے وقت ان کے حالات سے اپنی تقریر میں مدد لے سکے۔ اپنے ملک میں جو تازہ تصنیفات سامنے آتی رہتی ہیں ان سے بھی پورے طور پر واقف ہونا مقرر کے لیے بہت ہی ضروری ہے۔

۱۸- ملک اور بیرونِ ملک کے مشہور اداروں اور تاریخی مقامات سے مقرر کو واقفیت ہونی چاہیے نیز یہ کہ اسے تمام وہ دلچسپ روایتیں بھی یاد ہونی چاہییں جو اگرچہ تاریخی طور پر مستند اور معتبر نہیں ہیں، لیکن بعض عمارات یا بعض مشہور لوگوں کے متعلق زبان زد عوام ہیں۔

۱۹- مختلف ممالک کے رسم و رواج سے عموماً اور اپنے ملک کے رسم و رواج سے خصوصاً مقرر کو آگاہی ہونی چاہیے۔ ان چیزوں کے بیان میں اگر ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی ہے تو مقرر کی ہنسی اُڑ جاتی ہے اور اس کی تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اکثر شہر کے رہنے والے مقرر دیہات کے حالات سے ناواقف ہوتے ہیں اور مضافاتی علاقوں میں رہنے والے شہر کے حالات اور جدید عمرانیات سے باخبر نہیں ہوتے، ایسی صورت میں بعض اوقات ان کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل جاتی ہے جو واقعہ کے خلاف ہے تو لوگ اس پر بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔

۲۰- کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنے اور مسلسل تقریر کرتے رہنے کی مشق لینی بھی ضروری

ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ تقریر کے آخر میں جبکہ آواز میں زیادہ زور پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، آواز بیٹھ جائے اور تھکن اور کمزوری کی وجہ سے کھڑا رہنا اور بولنا دشوار ہو جائے۔

۲۱- موقع کی مناسبت سے رو دینے اور روکھی صورت بنا لینے کی مشق ہونی چاہیے۔ ہنسی اور مسکراہٹ کے متعلق مقرر کو خاص طور پر مشق کر لینی چاہیے کہ وہ نہ تو بالکل روکھی پھیکی ہو جس سے کوئی محظوظ نہ ہو سکے اور نہ اس قدر عامیانہ کہ رعب میں کمی پیدا کر دے۔

۲۲- مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس وقت جوش کا اظہار مقصود ہو تو سر تا پا جوش کی ایک زندہ تصویر بن جائے۔

۲۳- مقرر کے لیے ضروری ہے کہ حصول علم کے علاوہ اپنی قوت خیالیہ کو بھی تا حد امکان ترقی دے۔ جو مقرر اس قوت سے محروم ہیں وہ کبھی اچھے مقرر نہیں بن سکتے۔ تقریر میں تسلسل اور خیالات میں آمد قائم رکھنا قوت خیالیہ ہی کا کام ہے۔ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ تقریر کا تسلسل اور خیالات میں ربط قائم رہ سکے اور تسلسل اور ربط کے بغیر اچھی سے اچھی تقریر بھی ہزلیات اور ہذیانات کے طومار سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

۲۴- مقرر کے لیے اس بات کی مشق بھی ضروری ہے کہ مخالفین کی تقریر میں سے تمام قابل گرفت باتیں چن لیا کرے اور انہیں یاد رکھا کرے تا کہ جب اس کے جواب میں تقریر کرنے کھڑا ہو تو اس کے پاس اپنے مخالف کی تقریر کے اثر کو زائل کر دینے کے لیے کافی مصالحہ موجود ہو۔

۲۵- مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی نظر میں ایک شاعر یا ایک مصور کی سی باریک بینی پیدا کرے۔ جس طرح شاعری کے میدان میں وہی شاعر کامیاب رہتا ہے جو بالکل ناقابل لحاظ اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اپنی نگاہ میں رکھتا ہو اور جس بات کو بیان کرنے بیٹھے اس کی تمام جزئیات کا احاطہ کر لیتا ہو، اسی طرح ایک مقرر کی کامیابی کا راز بھی

اسی میں پوشیدہ ہے کہ اس کی نگاہ ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں تک پہنچتی ہو جنہیں دوسرے عام طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں۔

۲۶- شاعر اور مصور کی طرح مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچنے کی مشق پیدا کرے۔ رنج و غم اور درد و الم کی داستان اگر مشکل اور ثقیل الفاظ میں یا استعارات اور تشبیہات میں بیان کی جائے تو یہ تو ممکن ہے کہ لوگ مقرر کی ادبی قابلیت کی تعریف کرنے لگیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ان کے دل پر رنج و الم کی وہ کیفیت طاری ہو سکے جو مقرر کا مقصد ہے۔

۲۷- تقریر میں بسا اوقات کسی دعوے کو ثابت کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس کے لیے اگر مقرر منطقی اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو اور ان سے اپنی تقریر میں مدد لینے کی مشق کرلے تو وہ اپنی بات نہایت آسانی کے ساتھ عوام سے منوا سکتا ہے۔ اگر ہم مجمع کو بتائیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو یہ ایک ایسی صداقت ہے کہ اس سے انکار کرنے کی ہمارے کسی دُشمن کو بھی جرأت نہیں ہو سکتی اور ہر سر اس کی سچائی کے آگے ضرور جھک جائے گا، اس لیے اگر مقرر اس بات کی مشق کرلے کہ اپنے ہر دعوے کو اسی طرح ثابت کیا کرے تو اس کی مخالفت کی کسی کو جرأت نہ ہو سکے گی۔

۲۸- تقریر کرنے کے لیے پوری پوری مشق اور اچھی طرح ذہنی و زبانی تیاری کر لینے کے بعد مجمع عام میں آنے کی جرأت کرنی چاہیے۔

۲۹- تقریر کرنے کے لیے جب حاضرین کے سامنے آئے تو نہایت ہی پُر وقار اور سنجیدہ انداز سے آنا چاہیے اور اگر دل میں تھوڑا بہت اضطراب ہو بھی تو اسے حاضرین سے پوشیدہ رکھ کر ایسی چال سے چلنا چاہیے جس سے ارادے کی مضبوطی نمایاں ہو۔ جھجک جھجک کر قدم اُٹھانا، رُکتے ہوئے یا شرماتے ہوئے منبر یا ڈائس تک جانا اور اس طرح چلنا کہ جس

سے دل کی گھبراہٹ اور دماغ کی بدحواسی نمایاں ہو، مقرر کے لیے سخت نقصان دہ عادات ہیں۔ ایسی چال کو دیکھ لینے کے بعد لوگوں پر ایک اچھی اور معقول تقریر کا بھی بہت کم اثر ہوتا ہے۔

۳۰- ڈائس پر کھڑے ہو کر دیر تک کھانستے، کھنکارتے رہنا بھی عوام کے دل میں مقرر کی قابلیت کے متعلق شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

۳۱- تقریر کے شروع ہی میں یہ ضروری ہے کہ سامعین کے خیالات اور دماغ پر قابو حاصل کر لیا جائے۔ سامعین کی ذہنیت اور قابلیت کا پہلے سے اندازہ کر لینا چاہیے اور اپنی تقریر ایسے لفظوں میں اور ایسے انداز سے شروع کرنی چاہیے کہ جس سے ان کو فوراً دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیان سننے لگیں۔

۳۲- اگر کوئی مذہبی وعظ کہنا ہے تو چہرہ پر تقدس کے خوب نمایاں آثار پیدا کر کے ہمیشہ تقریر کی ابتدا خطبۂ مسنونہ، آیت یا حدیث سے کرنی چاہیے تاکہ لوگوں کے دلوں میں تعظیم کا جذبہ پیدا ہو جائے اور اگر تقریر میں کوئی خرابی بھی ہو تو لوگ مضحکہ اُڑانے کا خیال دل میں نہ لا سکیں۔

۳۳- جہادی تقریروں میں اپنے چہرہ پر جوش اور جذبے کے آثار پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور ایسی تقریر کی ابتدا کسی مشہور جہادی رہنما کے مقولہ سے یا کسی اچھے شاعر کے ایسے شعر سے کرنی چاہیے جو شوقِ شہادت میں ڈوبا ہوا ہو۔

۳۴- عدالت کے سامنے ایک وکیل کی حیثیت سے تقریر کرنی ہو تو ایمانداری اور صداقت کے آثار چہرہ پر ظاہر کر لینے چاہییں اور بلا کسی قسم کی تمہید کے پورے زور اور جوش کے ساتھ اپنے دلائل پیش کرنے چاہییں۔

۳۵- اسمبلیوں کی تقریروں میں تقریر کا جو عنصر سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے وہ خوش طبعی اور ظرافت ہے۔ ظرافت اگر عامیانہ نہ ہو تو تقریر کی جان ہوتی ہے۔

۳۶- پارلیمنٹ کے دوسرے مقرروں پر معنی خیز فقرے کسنا اور ان کے دلائل کا خوبصورتی کے ساتھ مذاق اُڑانا ایک ایسا حربہ ہے جس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور پارلیمنٹ کے مقرر کی کامیابی زیادہ تر ایسی ظرافت آمیز نکتہ چینی پر منحصر ہے۔

۳۷- سوائے ایسی تقریروں کے کہ جو اہلِ علم کے جلسہ میں کسی مخصوص علمی مسئلہ پر کی جائیں، اور کوئی تقریر علمی زبان میں نہ ہونی چاہیے۔ تقریر کی تاثیر علم صرف اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی زبان بالکل سلیس اور عام فہم ہو۔

۳۸- احباب کی مختصر محفلوں جیسے دعوت یا چائے نوشی کی محفل میں جو تقریریں کی جاتی ہیں، ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں خشکی اور سنجیدگی نہ ہو۔ ایسی تقریروں میں مزاح اور ظرافت کا عنصر جتنا زیادہ ہوگا، اتنا ہی اچھا ہے۔

۳۹- تقریروں کے لیے کچھ الفاظ مخصوص ہو چکے ہیں۔ مثلاً: جب جلسہ کی صدارت کے لیے کسی شخص کا انتخاب عمل میں آتا ہے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ شکریہ ادا کرے اور اس کے لیے لوگ بالعموم یہی کہہ دیا کرتے ہیں کہ آپ نے جو میری عزت افزائی کی ہے اس کے لیے میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ الفاظ اب بہت پرانے اور فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان کا سامعین پر کوئی اثر نہیں ہوتا، لیکن اگر اسی شکریہ کو کسی خوبصورت اور نئے طریقے پر ادا کیا جائے تو مجمع پھڑک اُٹھتا ہے۔

انگریز کے زمانے میں ایک سیاسی جلسے میں ایک مشہور مقرر کو صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے کرسی پر بیٹھنے سے قبل فرمایا:

''حضرات! غیر مقامی حکومت کی بدولت ہمیں جہاں اور ہزاروں طرح کے نقصانات پہنچے ہیں وہاں ایک بہت ہی بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ہماری قابلیت کا معیار بہت ہی گھٹ گیا ہے اور اب انتہا یہ ہے کہ مجھ جیسے شخصوں کو جلسوں کی صدارت کے لیے منتخب کرلیا جاتا ہے۔''

شکریہ ادا کرنے کا یہ طریقہ نہایت ہی اچھا سمجھا گیا اور صدر کی تمام تقریر انتہائی دلچسپی کے ساتھ سنی گئی۔

۴۰۔ اچھے مقرر بالکل اس طرح تقریر کرتے ہیں جیسے ماہی گیر دریا میں جال ڈالتا ہے۔ پہلے جال کو خوب پھیلا کر بہت سی جگہ اس کے اندر گھیر لی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو کھینچ کر ایک مرکز پر جمع کر لیا جاتا ہے۔ مقرر بھی اسی طرح اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سی مختلف باتیں بیان کر کے پھر ان سب کو ایک مرکز پر لاتا ہے اور اگر دلنشین الفاظ، خوبصورت ترکیبوں اور اچھے اسلوب بیان کے ذریعہ سے وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو تمام مجمع اس کے سحر میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

۴۱۔ خوبصورت تشبیہات اور دل کش استعارات کا استعمال تقریر میں جائز ہے بشرطیکہ وہ بالکل واضح ہوں اور لوگوں کو ان کے سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل نہ پیش آئے۔ اگر سمجھنے میں ذرا سی بھی مشکل ہوئی تو تقریر کا سارا مزہ ختم ہو جاتا ہے۔

۴۲۔ ایک مشہور عربی شاعر کا مقولہ ہے کہ شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سنانے والے کی زبان سے ابھی پورا ادا بھی نہ ہوا ہو اور سننے والوں کو اس کا قافیہ معلوم ہو جائے اور وہ اس کا مطلب سمجھ جائیں۔ اچھی تقریر کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اس قدر سلیس اور بامحاورہ زبان میں ہو اور ایسی مدلل ہو کہ مقرر کی زبان سے فقرہ پورا ہوئے بغیر سامعین اس کا کچھ مطلب سمجھ لیں تو وہ بہترین اثر پیدا کرے گی۔

۴۳۔ اکثر علمی تقریریں اس ترتیب سے کی جاتی ہیں کہ پہلے کچھ تھوڑی سی تمہید بیان کی، پھر اپنا دعویٰ پیش کیا، پھر دعوے کے ثبوت میں دلائل بیان کیے اور پھر ان دلیلوں سے نتیجہ نکال کر اپنے دعویٰ کو ثابت کر دیا۔

۴۴۔ علوم وفنون کے متعلق جو تقریریں (لیکچرز) ہوتی ہیں ان کے لیے یہی کتابی

ترتیب مناسب ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہیے، لیکن جن تقریروں کے ذریعے کوئی خاص جوش پیدا کرنا ہے ان میں یہ کتابی ترتیب زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔

٤٥- جوش پیدا کرنے والی تقریروں میں دعوے کا پہلے سے پیش کر دینا زیادہ مفید نہیں ہوتا، بلکہ اکثر یہ طریقہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے کہ پہلے اپنے زبردست ترین دلائل نہایت جوش کے ساتھ پیش کیے جائیں اور مجمع کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ از خود وہی نتیجہ نکالے جو ہمیں ثابت کرنا ہے۔ اکثر اس قسم کے موقعوں پر حاضرین کو خود ہی معلوم ہوتا ہے کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، اس لیے بھی دعویٰ پیش کرنا ایک فضول امر ہوتا ہے۔

٤٦- بعض مقرر پوری تقریر لکھ کر یاد کرنے کے بجائے جو کچھ انہیں کہنا ہے اس کے متعلق اشارتی نکات ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں اور تقریر کرتے وقت اسے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور اس سے مدد لیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک تو درست ہے، لیکن کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مقرر صاحب گھر سے لکھی ہوئی تقریر حفظ کر کے مجمع میں تشریف لائے اور کھڑے ہو کر اس طرح اپنی تقریر سنا دی جیسے بچے اپنا سبق یا حافظ صاحبان قرآن مجید سناتے ہیں۔ ایسی تقریروں پر بالکل معمولی لوگوں کو بھی ہنسی آ جاتی ہے اور تقریر بے اثر رہتی ہے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھی گئی ہیں کہ مقرر نے رَٹی ہوئی تقریر سنانی شروع کی اور اتفاق سے کسی جگہ کچھ بھول گئے اور سلسلۂ تقریر یکایک رُک گیا۔ عوام نے قہقہہ لگایا اور مقرر صاحب شرمندہ اور خفیف ہو کر پھر کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ رَٹی ہوئی تقریروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خوب ہی اچھی طرح یاد ہوں اور کم سے کم چار پانچ مرتبہ اپنے ساتھیوں کے سامنے دہرائی گئی ہوں۔

٤٧- رٹی ہوئی تقریر ابتدائی مشق کے لیے ہوتی ہے، اس کے بعد نہیں۔ جو لوگ ہمیشہ لکھی ہوئی تقریروں کو رَٹ رَٹ کر سنایا کرتے ہیں وہ کبھی مقرر نہیں ہو سکتے۔ مقرر وہی ہے جو

وقت پر برجستہ تقریر کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہایت ہی مختصر اشارے لکھ لیے جائیں اور اور دورانِ تقریر ان اشاروں سے مدد لے لی جائے۔

۴۸- بعض مقرر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ ان کی تقریر یوں تو نہایت ہی شاندار ہوتی ہے لیکن اس میں ربط اور تسلسل نہیں ہوتا۔ اپنی رو میں وہ جو چاہتے ہیں کہتے چلے جاتے ہیں اور اس سے کچھ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا اس میں اور اس میں کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں؟ اگرچہ تقریر کا زور اور الفاظ کی شان بڑی حد تک اس عیب کو چھپا لیتی ہے، پھر بھی تعلیم یافتہ سامعین کو ایسی تقریر میں کچھ زیادہ لطف نہیں آتا۔

۴۹- مقرر کا ''تکیہ کلام'' نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ بار بار ''کیا نام'' یا ''کیا کہتے ہیں'' یا ''خدا آپ کا بھلا کرے'' یا ''سمجھے جناب'' وغیرہ سننے سے سامعین کے کان پک جاتے ہیں اور تقریر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

۵۰- کبھی کبھی ایک اچھی تقریر کا اثر صرف اس لیے زائل ہو جاتا ہے کہ مقرر اپنے جوش میں برابر کہے ہی چلا جاتا ہے اور اس بات کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا کہ سننے والے اب تھک گئے ہوں گے۔ مقرر کو سامعین کے چہروں سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ اب وہ تھک گئے ہیں اور اس کے بعد زبردستی انہیں کچھ سنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ عام طور پر ایک تقریر کے لیے آدھ گھنٹے کا وقت کافی ہے۔ لیکن اگر تقریر دلچسپ ہو اور سامعین دلچسپی سے سن رہے ہوں تو گھنٹہ دو گھنٹے تک بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ دن میں جبکہ لوگوں کے کھانے کا اور رات میں جبکہ لوگوں کے سونے کا وقت آ گیا ہو تو لمبی تقریر ہرگز نہ کرنی چاہیے۔

۵۱- تقریر میں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ کوئی تاریخی واقعہ یا مذہبی مسئلہ غلط نہ بیان کیا جائے، نہ کوئی شعر غلط پڑھا جائے۔ اس قسم کی صرف ایک غلطی تمام تقریر کو بے کار کر دینے کے لیے کافی ہے۔

۵۲- اپنے دعوے کے ثبوت میں جہاں تک ممکن ہو اعداد و شمار اور تاریخی حوالہ جات پیش کرنے چاہییں۔ان چیزوں کا سامعین پر بڑا اثر ہوتا ہے اور تقریر کا رنگ جم جاتا ہے۔

۵۳- سامعین کو بُرا کہنا یا انہیں حقارت آمیز طریقے سے خطاب کرنا مقرر کی ایک ایسی غلطی ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

۵۴- اچھی تقریر کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ دلیری اور جرأت ہے۔جن لوگوں کے اعصاب کمزور ہوتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں میں اکثر مجمع کے سامنے آتے ہی رعشہ آ جاتا ہے اور زبان خشک ہو جاتی ہے۔اگر ایسی حالت طاری ہو جائے تو تقریر نہ کرنی ہی بہتر ہے۔

۵۵- مشق نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات مجمع کا خوف دل پر طاری ہو جاتا ہے، اس لیے بہت ضروری ہے کہ پہلے چھوٹے چھوٹے مجمعوں کے سامنے تقریر کر کے اچھی طرح عادت ڈال لی جائے۔

۵۶- تقریر کرتے وقت اپنا رُخ اس طرف رکھنا چاہیے کہ جدھر کم علم اور معمولی سمجھ کے لوگ بیٹھے ہوں یا ایسے لوگ بیٹھے ہوں کہ جن سے پہلے سے بے تکلفی ہو۔جس طرف زیادہ قابل اور زیادہ علم و فضل والے لوگ بیٹھے ہوں اس طرف رُخ نہ کرنا ہی زیادہ اچھا ہے۔کہیں ان کی قابلیت سے مقرر مرعوب نہ ہو جائے۔

۵۷- مقرر کو اگر کسی موضوع پر ایسی تقریر کرنی پڑے جو سامعین کے خیالات سے موافقت رکھتی ہو تو کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی لیکن ایسے موقعوں پر مقرر کو سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے جب سامعین کے خیالات اس کی اپنی رائے سے مختلف ہوں اور وہ انہیں ہم خیال بنانا چاہے۔

۵۸- جب مجمع کی رائے مقرر کی رائے سے مختلف ہو تو ایسی غلطی ہرگز نہ کرنی چاہیے

کہ مخالف رائے رکھنے والوں کو بُرا بھلا کہا جائے، بلکہ ایسے مواقع پر نہایت دانشمندی کے ساتھ مخالف کے جذبات کی تعریف کر کے اپنے خیالات اس طور پر پیش کرنے چاہییں کہ گویا ایک نئی چیز غور کرنے کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ دلیلوں میں زور اور آواز میں جوش بڑھنا چاہیے اور جب انداز سے یہ معلوم ہو کہ تقریر کا اثر ہو چلا تو پھر پورے جوش کے ساتھ سارا زور تقریر میں جھونک دینا چاہیے۔

۵۹- مخالف مجمع میں مقرر کی تواضع اکثر ایسے الفاظ سے کی جاتی ہے جن پر اسے غصہ آئے اور اس سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ مقرر جھنجھلا جائے اور معقول تقریر نہ کر سکے۔ ایسے مواقع پر غصہ کا اظہار کرنا گویا مخالفین کو ان کے ارادہ میں کامیاب کرنا ہے۔ مقرر کو کبھی بھی جھنجھلاہٹ کا شکار نہ ہونا چاہیے۔

٦٠- بعض اوقات مخالف مجمع میں یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ مقرر سے بیٹھ جانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ''ہم نہیں سننا چاہتے'' کا شور مچ جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ مجمع کی اس مخالفانہ روش سے خوف زدہ ہو کر ہرگز نہ بیٹھنا چاہیے، بلکہ نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے، جب شور و غل میں کمی آ جائے۔ شور کم ہوتے ہی فوراً اپنی تقریر کسی ایسے عجیب طریقے سے شروع کرنی چاہیے کہ لوگ حیرت زدہ ہو کر سننے لگیں۔ جہاں تھوڑا سا حصہ اس طرح سن لیا گیا تو پھر یہ تقریباً یقینی ہے کہ تمام تقریر سن لی جائے گی۔

٦١- نئے مقرروں کو جہاں تک ممکن ہو، مخالف مجمع میں تقریر نہ کرنی چاہیے۔ پرانے اور مشاق مقرر کسی قسم کے مجمع سے نہیں گھبراتے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ جتنا بڑا مجمع ہو ان کا جوش اتنا ہی بڑھتا ہے۔

٦٢- ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ شروع ہی میں کوئی ایسی بات کہہ دی جائے جس پر

سارا مجمع اُچھل پڑے اور ہر طرف جذبات کی لہر دوڑ جائے۔ داد ملتے ہی مقرر کے دل سے خوف و ہراس دور ہو جاتا ہے اور پھر وہ بے خوفی اور خود اعتمادی سے تقریر کرنے لگتا ہے۔

٦٣- سخت بھوک یا سخت تھکن کے وقت تقریر نہ کرنی چاہیے۔

٦٤- تقریر میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے فقروں سے کام لینا چاہیے۔ لمبے چوڑے فقروں کے سمجھنے میں کہ جن کا مطلب دور جا کر نکلتا ہو، مجمع کو سخت مشکل ہوتی ہے اور جس تقریر کے سمجھنے میں لوگوں کو مشکل ہو اس کا اثر سب کو معلوم ہے۔

٦٥- اعصابی کمزوری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ تقریر کرتے کرتے یکا یک گلا بیٹھ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے گلے کا صحیح اندازہ ہونا چاہیے کہ کتنے عرصہ تک کام دے گا اور اسی مناسبت سے تقریر کرنی چاہیے۔

٦٦- آواز کو درست رکھنے کے لیے دواؤں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ دیسی دواؤں میں ملہٹی، مصری، پان اور لونگ بہت اچھی چیزیں ہیں۔ انگریزی اور ہومیو پیتھک دواؤں میں بھی آواز کی صفائی کے لیے کچھ اچھی دوائیں بازار سے ملتی ہیں...... لیکن...... ان کی عادت ڈال لینا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

٦٧- گلے کے بٹن اگر کسے ہوئے ہوں یا سینہ پر تنگ کپڑے ہوں تو اکثر سانس جلدی سے پھولنے لگتا ہے۔ روزانہ کھلی ہوا میں سانس کی ورزش کرنے سے سانس پر اچھی طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔

٦٨- مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا تلفظ بالکل صحیح ہو۔ لکھنو کو اگر نکھلو کہہ دیا تو ساری تقریر ہی بے کار ہو جائے گی۔ فارسی، عربی یا انگریزی کے الفاظ اگر تقریر میں استعمال کیے جائیں تو ان کے صحیح تلفظ کا پورا پورا خیال رہنا چاہیے۔ بعض مقرر انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں اور صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ انگریزی بھی جانتے ہیں، اپنی تقریر میں دو چار

لفظ انگریزی کے بھی بول جاتے ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ صحیح طور پر انگریزی کے الفاظ نہیں بول سکتے اور لوگوں کو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ انگریزی سے ناواقف ہیں اور انگریزی دان بن رہے ہیں۔ ایسی صورت میں علمیت جھاڑنے کا جو منفی اثر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۶۹- آواز کا اُتار چڑھاؤ بھی تقریر کا ایک ضروری جزو ہے۔ جہاں آواز پست رہنی چاہیے تھی وہاں اُسے بلند کر دینے سے تقریر کا سارا لطف جاتا رہتا ہے۔

۷۰- بعض لوگ بہت تیز بولتے ہیں۔ تقریر کرتے وقت ایسی تیزی اچھی نہیں ہوتی۔ جلدی جلدی زبان سے نکلے ہوئے فقرے سمجھ میں بہت مشکل سے آتے ہیں اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے وہ یقیناً فضول اور بُری ہے۔ تقریر اتنے آہستہ لہجہ میں کرنی چاہیے کہ اس کا ایک ایک لفظ اچھی طرح سامعین کی سمجھ میں آ جائے۔

۷۱- موقع موقع سے آواز پر زور دینا اور ایک فقرہ کو دوسرے سے جدا کرنے کے لیے ذرا سا واقفہ دینا تقریر کو بہت حد تک آسان اور قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔

۷۲- ہاتھوں اور انگلیوں کے موزوں اشارے بھی تقریر کا اثر دوبالا کر دیتے ہیں۔ لیکن ہاتھوں کے اشارے اور جسم کی حرکتیں عامیانہ اور رکیک نہ ہونی چاہییں۔ نظریں نیچی رکھنا، جسم کو غیر مناسب انداز میں جھلانا، کندھے مٹکانا یا بار بار کبھی اِدھر کو اور کبھی اُدھر کو جھک جانا بدنما حرکتیں ہیں اور ان سے احتراز ہی بہتر ہے۔

۷۳- اظہارِ جوش کے وقت جب آواز بلند ہو تو ساتھ ہی ساتھ ہاتھ کا ایک خاص انداز میں اوپر کو اُٹھنا زورِ تقریر میں بہت اضافہ کر دیتا ہے۔ بسا اوقات پاؤں کی جنبش بھی تقریر کا زور بڑھا دیتی ہے۔ مثلاً: کسی شخص یا چیز سے نفرت دلانی ہو اور اس کے متعلق یہ کہنا ہو کہ اگر فلاں شخص یا چیز ہمارے راستہ میں حائل ہو تو ہمیں چاہیے کہ اُسے ٹھکرا دیں۔ آخری لفظ زبان سے

نکالتے وقت اگر پاؤں سے ٹھوکر کا اشارہ بھی کر دیا جائے تو اثر بہت زیادہ ہو جائے گا۔

۷۴- بعض مقرر اپنے ہاتھوں میں عصا رکھتے ہیں اور اسے زور زور سے زمین پر مارتے رہتے ہیں۔ عصا کی یہ جنبش اور اسٹیج پر اُس کے کھٹکے اگر دورانِ تقریر میں صرف چند ایک ہی مرتبہ ہوں تو کارآمد ثابت ہوتے ہیں، لیکن بار باران کا اعادہ کچھ بہت اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بعض مقرر اپنے ہاتھ میں پنسل یا قلم رکھتے ہیں اور دورانِ تقریر اس سے بہت ہی خوشنما اشارے کرتے جاتے ہیں۔ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اور سینہ تان کر کھڑے ہونا تقریر کے شروع میں تو کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر مقرر برابر ایسی ہیئت اور وضع میں کھڑا رہے تو اس کا نگاہوں پر کسی قدر بُرا اثر پڑنے لگتا ہے۔

۷۵- مقرر کے آنے جانے، اُٹھنے بیٹھنے کا انداز نہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے شیخی اور غرور ٹپکے اور نہ ایسا کہ اس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی بالکل ہی معمولی آدمی ہے۔ اس کی چال ڈھال اور اندازِ گفتگو سب سے یہ بات ظاہر ہونی چاہیے کہ وہ ایک اولوالعزم اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرنے والا انسان ہے۔

۷۶- سنجیدگی اور متانت مقرر کا بہت ہی زبردست ہتھیار ہے۔ ظرافت میں بھی سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ ہلکا پن اور چھچھورا پن مقرر کی بدترین صفات ہیں اور یہ کبھی اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ تقریر کے دوران کوئی لطیفہ یا مختصر سا قصہ بیان کیا جاسکتا ہے لیکن اس بات کا ہر وقت لحاظ رہنا چاہیے کہ اصل موضوع کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ مثال کے طور پر بیان کیے گئے چھوٹے چھوٹے قصے تقریر کو بہت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

۷۷- بسا اوقات سوالیہ انداز میں تقریر کرنے سے تقریر کا زور بہت ہی بڑھ جاتا ہے۔ بجائے یہ کہنے کے ''ایسا نہیں ہوسکتا'' اگر یہ کہا جائے ''کیا کسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے؟'' تو

بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔

۷۸- یوں تو مقرر کے لیے تندرست اور مضبوط ہونا لازمی ہے، لیکن زکام اس کا بدترین دُشمن ہے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو آواز خراب ہو جاتی ہے اور دوسری طرف بار بار کھانسی اُٹھتی ہے۔

۷۹- تقریر کے دوران مقرر کے چہرے کو مقرر کے دل کا آئینہ ہونا چاہیے۔ رنج و غم کے واقعات بیان کرتے وقت مقرر کا چہرہ درد و الم کی تصویر بن جائے۔ دلیری اور شجاعت کا ذکر ہو تو مقرر کے چہرے سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے بڑھ کر دلاور دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔ ہمدردی اور خلوص کا ذکر کرتے وقت مقرر کو ایثار و ہمدردی کا مجسمہ بن جانا چاہیے۔ مذہبی باتیں بیان کرتے وقت چہرہ سے شانِ تقدس عیاں ہونی ضروری ہے۔ یہ باتیں پہلے بھی بتائی جا چکی ہیں۔

۸۰- اگر مقرر کا چال چلن اچھا نہیں ہے یا اس کے عادات و مزاج کے متعلق لوگوں میں اچھی شہرت نہیں ہے تو اسے کبھی تقریر کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ جس شخص کے متعلق لوگ پہلے ہی سے یہ رائے رکھتے ہوں کہ وہ خراب آدمی ہے، اس کی تقریر کبھی اور کسی حالت میں بھی لوگوں کے دلوں کو نہیں گرما سکتی۔ ایسے لوگ کہ جن کی بداخلاقی سے لوگ واقف ہیں، صرف اس طرح مجمع عام کے سامنے آسکتے ہیں کہ کھڑے ہوتے ہی یہ کہہ دیں کہ میں نالائق اور بدافعال شخص تھا، لیکن فلاں چیز کا مجھ جیسے شخص پر بھی یہ اثر ہوا ہے کہ اپنی تمام خراب حرکتیں چھوڑ کر سچے دل سے اس خدمت کے بجالانے پر آمادہ ہو گیا ہوں ...... وغیرہ وغیرہ۔

تقریر سیکھنے اور سکھانے کے طریقے

طالب علم کو تقریر سکھانے کے دو طریقے تو کتاب کے شروع میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ کوئی حرج نہیں کہ ہم انہیں یہاں دہرالیں:

۱- اگر کوئی طالبعلم تقریر کرتے ہوئے جھجھکتا ہے تو جس درجے میں وہ پڑھ رہا ہے اس درجے کی بنیادی کتاب سے کوئی بحث منتخب کر کے اسے دے دی جائے کہ اسے بیان کرو۔ مثلاً مبتدی ہے تو آخری سپارہ یا زادالطالبین سے اور منتہی ہے تو جلالین یا مشکوٰۃ شریف سے کوئی آیت یا حدیث متعین کر دی جائے کہ اس کا ترجمہ وتشریح کرو۔ تدریس کا ڈھنگ بھی آجائے گا اور بے تکلف بولنا بھی سیکھ جائے گا۔

۲- دوسرا طریقہ حضرت نے ان علماء کے لیے بیان فرمایا تھا جو بیان کرنے سے کتراتے ہیں۔ حضرت نے ان کو یہ تدبیر بتائی کہ شروع شروع میں مشکوٰۃ شریف وغیرہ (مثلاً ریاض الصالحین یا معارف الحدیث) لے کر بیٹھیں اور کتاب سے دیکھ کر بیان کریں۔ یعنی عربی کی عبارت کتاب سے دیکھیں اور اس کی شرح عوام کو زبانی سمجھائیں۔ کچھ دنوں کے بعد بغیر کتاب دیکھے بیان شروع کر دیں۔ اس طرح ایک دن خوب روانی کے ساتھ فی البدیہہ بیان کرنا ممکن ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ دونوں طریقے حقیقت میں ایک ہی ہیں اور آگے جو تیسرا طریقہ آرہا ہے، ان دونوں کو اس میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت دے اور توفیق ظاہری و باطنی عطا فرمائے۔ آمین۔

۳- عام طور پر دینی مدارس میں وعظ و خطابت سیکھنے سکھانے کے لیے ہفتے میں ایک مرتبہ "انجمن" منعقد کیے جانے کا طریقہ مروّج ہے۔ یہ سب سے اچھا اور کامیاب طریقہ ہے۔ ہر درجے کی ایک انجمن قائم کرلی جائے اور اس میں آٹھویں یا پندرہویں روز مختلف عنوانات پر بیان ہوا کرے۔ اگر ممکن ہو تو کسی ماہرِ فن یا مبصر کو بھی اس انجمن میں شریک کرلیا جایا کرے جو آخر میں ہر ایک مقرر کو اس کی خامیوں سے آگاہ کردیا کرے۔ جب آپ اپنے ساتھیوں کے سامنے بول لیں گے تو اجنبیوں کے سامنے جانے سے پہلے اس نادیدہ اور غیر مرئی خوف سے نجات پاچکے ہوں گے جو عموماً نوآموز خطبا کو گھیر لیتا اور ان کی کارکردگی کو متاثر کرتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم گھبرائے اور زبانی تقریر نہ کرسکے تو اسے کسی درسی کتاب سے کوئی جگہ منتخب کر کے دی جائے کہ حاضرین کو یہی سمجھائے یا حدیث شریف کی کوئی کتاب مثلاً زادالطالبین، ریاض الصالحین یا معارف الحدیث دی جائے کہ اس سے عربی عبارت دیکھ کر بیان کرے۔

تقریری انجمنوں کو مؤثر بنانے کا طریقہ:

ہماری رائے میں نوآموز طلبہ کو وعظ و خطابت سکھانے کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے، بس اس کو ذرا منظّم اور بارآور بنانے کی ضرورت ہے۔ اس غرض کے لیے غور وفکر اور تجربے کے بعد دو چارٹ تیار کیے گئے ہیں۔ ایک ہر جماعت کے لیے اور دوسرا ہر طالب علم کے لیے۔ ان چارٹوں کے ذریعے انجمن کے اس روایتی طریقے کو مؤثر اور مفید بنایا جاسکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ چارٹ دیکھے جاسکتے ہیں۔

تقریر کے جائزہ اور نتیجہ کے لیے دو چارٹ:

ان چارٹوں کے ذریعے انجمن میں شریک ہر طالب علم کی کارکردگی کی جانچ بھی ہوجاتی ہے اور تربیت بھی۔ تقریری مقابلوں کی منصفی کے لیے بھی انہیں بعینہٖ یا حسب ضرورت

ترمیم واضافے کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ان چارٹوں کے دو مقاصد ہیں:

۱- نگرانی میں سہولت:

عام طور پر اساتذۂ کرام انجمن کی نگرانی نہیں فرماتے جس کی بنا پر خطابت سیکھنے سکھانے کے اس مؤثر عمل کی افادیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ اساتذہ کا عذر اکثر یہ ہوتا ہے کہ نگرانی کس طرح کریں؟ اور طلبہ کی تربیت کن خطوط پر ہو؟ اس چارٹ میں تقریر کے مختلف محاسن کو ان کی اہمیت کے بقدر نمبرات تفویض کیے گئے ہیں۔ اساتذۂ کرام کا کام بس اتنا رہ جاتا ہے کہ ہر طالب علم کی کارکردگی کے مطابق اس چارٹ کو بھریں اور انجمن کے آخر میں اس کا خلاصہ پڑھ کر سنادیں۔ اساتذۂ کرام کی طرف سے اس چارٹ کو بھرنا اور اس کی روشنی میں ہر طالب علم کی خوبی وخامی سے آگاہ کرنا نگرانی کے عمل کو آسان کرتا اور طلبہ کی کارکردگی کو حیرت انگیز طور پر بہتر بناتا ہے اور نگران کار کی یہ کاوش طلبہ میں انجمن کی اہمیت بڑھاتی، ان میں نظم وضبط پیدا کرتی اور انجمن کی افادیت کو دوچند کرتی ہے۔

۲- احتساب وتربیت:

اس چارٹ میں ایک طرح سے پوری کتاب کا خلاصہ سا آگیا ہے۔ طالب علم اس کے ذریعے اپنی اصلاح نہایت مؤثر اور آسان طریقے سے کرسکتا ہے۔ تجربہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اساتذۂ کرام اگر اس چارٹ کو پُر کریں اور نتیجہ کے طور پر جامعہ کے اطلاعاتی تختے پر یا درس گاہ کے باہر اسے آویزاں کریں تو طالب علم کی خامیوں میں حیرت انگیز طور پر کم ہوتی اور خوبیوں میں اضافہ ہوتا ہے، لہٰذا یہ چارٹ ایک طرح کا محتسب بھی ہے اور مربّی بھی۔

نگران استاد کے لیے ہدایات:

۱- چارٹ کو استعمال میں لانے سے قبل زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرلیں۔

۲- انجمن کے آغاز سے قبل اس کتاب کے اہم ابواب کی تعلیم کرلیا کریں۔

۳- اگر طالبعلم براہِ راست تقریر کرنے سے گھبرا رہا ہے تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تلقین کردہ تدبیر (جو ابھی شروع میں بیان ہوئی) آزمائیں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں۔

۳- چارٹ نمبر ۱ "درجہ وار" ہے۔ اس میں آٹھ طلبہ کے نتائج درج ہو سکتے ہیں۔ ایک طالب علم کو دس منٹ دیے جائیں تو ایک انجمن میں آٹھ طلبہ سے زیادہ کو وقت ملنا مشکل ہے۔ اس لیے اس میں صرف آٹھ طلبہ کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

چارٹ نمبر ۲ انفرادی نتائج کے لیے ہے۔ اس میں ہر طالب علم کے سال بھر کے نتائج اور کارکردگی ایک نظر میں سامنے آجاتی ہے۔ عموماً سال بھر میں ایک طالب علم کو دس سے زیادہ تقاریر کا موقع ملنا مشکل ہے۔ اس لیے اس میں دس تقاریر کا نتیجہ دیا گیا ہے۔ پورے سال کے نتائج دیکھنے کے بعد طالب علم اپنی ترقی کا جائزہ خود لے سکتا ہے۔

یہ دونوں طرح کے چارٹ نگران استاد صاحب کی فائل میں لگے ہوئے ہونے چاہییں۔ سال کی ابتدا میں ایک نوآموز کیسا تھا؟ سال کے اختتام تک اس نے کیا کچھ سیکھا؟ کتنی بہتری آئی؟ ان دونوں چارٹوں کے ذریعے ایک نظر میں مکمل جائزہ سامنے آجاتا ہے۔

٤- چارٹ میں تقریر کی چار اقسام دی گئی ہیں: درسِ قرآن وحدیث، اصلاحی بیان، فکری نشست سے خطاب اور عام تقریر۔ ان میں فرق کتاب کے شروع میں "خطابت کی اقسام" میں بیان کیا گیا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

٥- ہر طالبعلم کو سات منٹ تقریر کے اور تین منٹ سوال و جواب کے لیے دیے جائیں۔ سوالات کا سامنا کرنے سے مقرر میں خود اعتمادی اور سامعین میں توجہ و دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

٦- نگران استاد کو چاہیے کہ تربیتی نشست کے اختتام پر طلبہ کو اگلی نشست کے لیے

آیت، حدیث، اصلاحی بیان کا عنوان اور موضوع دے دیں تاکہ طلبہ ہفتے بھر تیاری کر سکیں۔

۷- چارٹ میں درج نتائج تربیتی نشست کے آخر میں سنائے جائیں اور پھر تین دن تک بورڈ پر آویزاں کیے جائیں۔ اس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں نتائج فائل میں لگا دیے جائیں۔

۸- ان چارٹوں میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

درسِ قرآن

درسِ قرآن

اہمیت وضرورت:

خطابت کا اصل مقصد " دعوت وتبلیغ" ہے۔اس مقصد کے حصول کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل درس قرآن بھی ہے۔اس سے آج کل نہایت غفلت برتی جارہی ہے جس کا خمیازہ عوام کی دین سے دوری کی شکل میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔علمائے کرام اورعوام میں فاصلے پیدا ہورہے ہیں اور نیم خواندہ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر حضرات اس خلا کو پُر کر کے "ضلّوا و أضلّوا" کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

اُمّتِ مُسلِمہ کا عروج وزوال قرآن مجید سے وابستہ ہے۔صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا، وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ". (۱)

" یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کچھ قوموں کوعزت، اقتداراور سربلندی سے نوازے گا اور کچھ دوسری قوموں کوذلت، پستی اور شکست سے ہمکنار کرے گا۔"

جو شخص دعوت وتبلیغِ اسلام اور اقامتِ دین کا پیغمبرانہ مشن اختیار کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے لازمی اور ضروری ہے کہ وہ درسِ قرآن کا طریقہ سیکھے اور دعوت وتبلیغ کے لیے اس سے استفادہ کرے۔

۱- مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب ٤٧، حدیث ۱۹۳٤

قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا حکم دے کر قرآن پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس لیے کہ قرآن ایک کتابِ دعوت وہدایت ہے۔ ایک کتابِ انذار وتبشیر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بارے میں جو واقعہ نقل ہوا ہے، اس سے قرآنِ مجید کی تاثیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور سچے اہلِ ایمان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

"وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيٰتُهٗ، زَادَتْهُمْ إِيمَانًا". (۱)

قرآن کریم کی مختلف آیات میں ذَكِّرْ بِهٖ، لِتُنْذِرَ بِهٖ اور جَاهِدْهُمْ بِهٖ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو اس امر کے متقاضی اور واضح ثبوت ہیں کہ داعیانِ دین اور مبلغینِ اسلام کبھی قرآن سے غافل نہیں رہ سکتے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا میں طویل قید گذار کر ہندوستان واپس تشریف لائے تو اپنی ہنگامہ خیز زندگی کے تجربات کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"میں مالٹا سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً ومعنًی عام کیا جائے۔"

اس کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیاوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی...... اس لیے میں وہیں سے عزم کر کے آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی

۱- الأنفال: ۲

اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

اب لفظی تعلیم کا مبارک عمل مکاتب و مدارس کی شکل میں کافی حد تک زندہ ہے لیکن معنوی تعلیم کا فریضہ تاحال مردانِ خدا کے حوصلوں کا منتظر ہے۔

ہمارے ملک کی تقریباً ستر فیصد آبادی ناخواندہ ہے اور ہماری مادری زبان بھی عربی نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ افراد میں کتنے فیصد لوگ ایسے ہیں جو دینی رجحان رکھتے ہیں۔ شاید ان کی تعداد دس فیصد سے زیادہ نہ ہو۔ ان دس فیصد میں سے کتنے فیصد افراد ایسے ہیں جو قرآنِ مجید کو پڑھنے، سمجھنے، اس میں غور و فکر کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کو معاشرے میں عام کرنے کا جوش، جذبہ، ولولہ، لگن اور تڑپ رکھتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ صورتحال نہایت تشویش ناک ہے۔

علمائے کرام اور مساجد کے ائمہ حضرات کو چاہیے کہ تعلیم یافتہ افراد میں قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ کو سیکھنے اور سکھانے کا رجحان پیدا کریں۔ یہ مقصد گلی گلی، کوچہ کوچہ درسِ قرآن اور فہمِ دین کی محفلوں کو آراستہ کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کام سے پہلے تربیت یافتہ، مدرسین اور مربّین (Master Trainers) کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو قرآنِ مجید اور سنتِ مطہرہ کی بنیادی تعلیمات کو درسِ قرآن و حدیث کے ذریعے لوگوں کو سکھانے اور سمجھانے کا ہنر سیکھ لے۔ آئندہ صفحات میں اسی غرض سے "درسِ قرآن و حدیث" کے متعلق چند کارآمد باتیں ذکر کی گئی ہیں۔

درسِ قرآن کے بنیادی اُصول

۱- درسِ قرآن کے مقصد کا تعین کر لیجیے:

درسِ قرآن کی تیاری کے سلسلے میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ درسِ قرآن کا مقصد متعین اور واضح ہونا چاہیے:

۱- اللہ کے بندوں کو، اللہ کے کلام کے ذریعے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑنا ہے۔ اللہ کا بندہ بنانا ہے۔

۲- قرآن کریم، انبیائے کرام اور بالخصوص جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت لوگوں تک پہنچانا ہے۔

۳- عقائد کی تصحیح اور اعمال واخلاق کو سنت نبویہ کے مطابق ڈھالنا ہے۔

٤- نفوس کا تزکیہ، معاشرے کا تزکیہ اور اپنی وسامعین کی اصلاح کرنا ہے۔

٥- لوگوں کو نیک کاموں کی طرف راغب کرنا اور گناہ چھوڑنے پر آمادہ کرنا ہے۔

٦- لوگوں میں اللہ کی صفات اور آخرت کی جزاوسزا کے تصور کو راسخ کرنا ہے۔

(مکی سورتوں میں صفاتِ الٰہی اور تذکرۂ جنت و دوزخ سے عقیدۂ توحید کو جوڑا گیا ہے جبکہ مدنی سورتوں میں تمام اجتماعی احکام کے ساتھ صفاتِ الٰہی اور ثوابِ جنت وعذابِ دوزخ کو مربوط کیا گیا ہے۔)

۲-اپنی صحیح حیثیت کا تعین کر لیجیے:

مدرس اپنی حیثیت کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ بنیادی طور پر ایک داعی ہے، ایک مبلّغ ہے اور ایک طالب علم ہے۔ وہ مفسّر قرآن نہیں ہے۔ محدّث نہیں ہے۔ فقیہ اور مجتہد نہیں ہے۔ اپنی حیثیت کا صحیح احساس وشعور، مدرس کو بے شمار فکری اور عملی غلطیوں سے ان شاء اللہ محفوظ رکھے گا۔ ہمارے ایک صاحبِ علم مفتی دوست، جو سند یافتہ مفتی ہیں، اپنے آپ کو مفتی نہیں گردانتے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو " نَاقِل " کہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں " کوئی مسئلہ پوچھتا ہے تو میں کسی کتاب سے نقل کر دیتا ہوں۔ " یہ احتیاط کی علامت ہے۔

۳- تیاری کے بغیر درس نہ دیجیے:

بھرپور تیاری کیجیے۔ بغیر تیاری کے کوئی درس نہ دیجیے۔ آپ کی محنت اتنی اچھی ہو کہ لوگ قلبی سکون واطمینان کے ساتھ تازگی اور فرحت محسوس کریں۔ سامعین یہ خیال کریں کہ یہ بات تو ہم نے پہلی بار سنی ہے یا یہ آیت تو ہم نے بار بار پڑھی لیکن اس پہلو سے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ یا اس درس سے ہم میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ کوئی بات غیر مستند اور بلا حوالہ نہ ہو لیکن درس میں جدت اور انفرادیت ہو۔

٤- "جملۂ مُعترضہ" طویل نہ ہونے پائے:

کوشش کیجیے کہ "جملۂ مُعترضہ" طویل نہ ہونے پائے۔ مثلاً دورانِ درسِ قرآن، واقعۂ فرعون وموسیٰ میں آپ نے "مصر" کا ذکر کیا، ضمناً "قاہرہ" کا ذکر آ گیا، قاہرہ سے بات "جامعہ ازہر" تک جا پہنچی۔ اس طرح آپ اصل موضوع سے دور نکل جائیں گے۔ اس کمزوری سے آپ صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جب آپ کی نگاہ مقصد پر مرکوز ہو۔

۵-مُستند واقعات بیان کیجیے:

موضوع احادیث، غیر مستند واقعات، من گھڑت مذہبی داستانیں، غیر معتمد اخباری

مضامین اور بلا سند باتوں سے پرہیز کیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبردار کیا ہے:

"کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِباً اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَاسَمِعَ". (۱)

"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات، بیان کر ڈالے۔"

٦-لفّاظی سے اجتناب کیجیے:

سادہ اور عام فہم زبان استعمال کیجیے! ثقیل اور نامانوس الفاظ سے پرہیز کیجیے! اس سے آپ کی علمیت اور زبان دانی کی دھاک تو بیٹھ سکتی ہے، عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح مُقفّٰی، مُسَجّع الفاظ اور لفّاظی سے گریز کیجیے۔ مثلاً قرآنِ مجید کے ساتھ فرقانِ حمید اور فرزندِ بتول کے ساتھ جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسے الفاظ کا اضافہ ع

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اصل چیز سوزِ قلب اور دعوتِ عمل ہے۔ لفظ سے زیادہ معانی پر آپ کی نگاہ ہو۔ اپنی خطابت کا ڈنکا بجانے کے بجائے لوگوں کی زندگی میں عملی انقلاب برپا کرنا پیشِ نظر ہو۔

۷- گفتگو کو نِکات میں تقسیم کرلیجیے:

آپ کا اسلوب سائنٹیفک (Scientific) ہونا چاہیے، یعنی درس کا خاکہ بنا کر مرتب نِکات (Points) میں تقسیم کر لیجیے۔ پھر باری باری تمام نکات کو ان کی اہمیت کے مطابق بیان کرتے جائیے۔

۸- تکلف سے بچیے:

دورانِ درس کوئی شعر، حکایت یا لطیفہ وغیرہ بلاتکلف یاد آ جائے تو سنا دیجیے، لیکن کسی شعر وغیرہ کو بغیر مناسبت کے بزور منطبق کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔

۱- مسلم، کتاب المقدمۃ، باب ۳، حدیث ۷

بقول اقبال

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنیٰ کو؟
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

حسنِ صوت نعمت خداوندی ہے اس سے بھرپور کام لیجیے لیکن اگر آواز مترنم نہیں تو بتکلف طرز بنانے کی کوشش عبث ہے۔

۹- اپنی ذات کے لیے کچھ نہ مانگیے:

اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کچھ طلب نہ کیجیے۔ مدرس جب دستِ سوال دراز کرتا ہے تو اس کی ساری تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں کئی پیغمبروں کی زبان سے کہلوایا گیا:

"وَمَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ، اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ". (۱)

"اور میں اس خدمت پر آپ سے کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں۔ میرا اجر تو پروردگارِ کائنات کے ذمے ہے۔"

اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہتی ہے:

" مَنۡ قَرَأَ الۡقُرۡآنَ فَلۡيَسۡأَلِ اللّٰهَ بِهٖ، فَاِنَّهٗ سَيَجِيۡءُ اَقۡوَامٌ يَقۡرَءُوۡنَ الۡقُرۡآنَ يَسۡأَلُوۡنَ بِهِ النَّاسَ". (۲)

" جو شخص قرآن پڑھے، اُسے چاہیے کہ اللہ ہی سے مانگے، اس لیے کہ عنقریب ایسے افراد پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھ کر لوگوں سے مانگیں گے۔"

ایک دوسری حدیث میں نہایت سخت وعید سنائی گئی ہے:

"مَنۡ قَرَأَ الۡقُرۡآنَ يَتَأَكَّلُ بِهِ النَّاسَ، جَآءَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ وَوَجۡهُهٗ عَظۡمٌ لَيۡسَ عَلَيۡهِ لَحۡمٌ". (۳)

۱- الشعراء: ۱۰۹   ۲- ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ۲۰، حدیث ۳۱٦۷

۳- البیهقی، شعب الأیمان، باب ۱۹

"جو شخص قرآن پڑھے اور اس کے ذریعے لوگوں سے کھائے، وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہوگا۔ چہرے پر گوشت نہیں ہوگا"۔

۱۰- اہم بات کو تین مرتبہ دہرائیے:

اہم بات کو تین مرتبہ دُہرانا سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ خلاصۂ مضمون، درس کے آغاز میں بیان کیجیے، پھر اس کی تشریح کیجیے اور آخر میں خلاصۂ مضمون کا اعادہ کیجیے۔ اس طرح بات تین مرتبہ سامعین تک پہنچ جائے گی اور سامعین کے ذہن پر نقش ہو جائے گی۔

حدیث انس رضی اللہ عنہ میں ہے:

"عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللّٰه علیه و سلم: اَنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ، اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ". (۱)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تو بات کو "تین مرتبہ" دہراتے یہاں تک کہ ان کی بات پوری طرح واضح ہو جاتی۔"

۱۱- ہر ہفتہ ایک نیا موضوع منتخب کیجیے:

درس کے مضامین مُتنوّع ہوں، ان میں یک رنگی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ سال کے باون ہفتوں میں ایک ہی موضوع پر درس دیں۔ اس طرح آپ کے درس میں لوگوں کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی جائے گی۔ اسلام ایک جامع دین ہے۔ یک رنگی کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا مطالعہ اور آپ کی صلاحیت دونوں ناقص ہیں اور آپ اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا نہیں چاہتے۔ اس مضمون کے آخر میں آپ کی آسانی کے لیے متعدد موضوعات اور ان کی مناسبت سے آیات دی گئی ہیں۔

۱- بخاری، کتاب العلم، باب ۳۰، حدیث ۹۵

۱۲- اپنے ظاہر کو شائستہ بنائیے:

مدرس کا حلیہ اور لباس سنت کے مطابق اور رویہ شائستہ اور اخلاق نبویہ سے آراستہ ہو۔ دنیا کا قاعدہ ہے، مظروف کے مطابق ظرف بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح مدرس کا لباس اور رویہ بھی درسِ قرآن کی اثر انگیزی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نیز مدرس کو چاہیے کہ وہ سامعین کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھے۔ سوال جواب کی محفل میں برافروختہ اور بے برداشت نہ ہو۔

دورانِ درس، پان، چھالیہ وغیرہ کا استعمال نہ کیجیے اور نہ ہی سر یا بدن کھجائیے۔ اس طرح کی غیر شائستہ حرکات سے گریز کیجیے۔

۱۳- اپنے باطن کو ظاہر سے بہتر کیجیے:

ہمارا باطن ہمارے ظاہر سے بہتر ہونا چاہیے۔ اگر ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب تو پھر اس کا شمار ریا کاری میں ہوگا۔ اس کے برعکس اچھے باطن کے ساتھ اچھا ظاہر ریا کاری نہیں بلکہ "اتباعِ سنت" کہلائے گا۔ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوبصورت دعا سکھائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِي خَيْراً مِّنْ عَلَانِيَتِي، وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِي صَالِحَةً". (۱)

"اے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر بنادے اور میرے ظاہر کو نیک بنادے۔"

درسِ قرآن محض توسیعِ دعوت، حصولِ جنت اور خوشنودیٔ پروردگار کی نیت سے دیا جائے۔ نیت کی درستی، ہر عمل کی قبولیت کے لیے ایک بنیادی شرط ہے۔ مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریا کاری سے بچے اور ریا کاری سے بچنے کے لیے اللہ کی مدد طلب کرے۔ اُسے نہ شہرت کی خواہش ہو اور نہ مال و دولت کی۔ ہوس کا شکار ہو اور نہ جاہ و منصب کا طالب۔ ستائش کی تمنا ہو اور نہ صلے کی پروا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ ع

۱- ترمذی، کتاب الدعوات، باب ۱۴۰، حدیث ۳۹۳۵

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

مدرس کی ہمیشہ یہ دعا ہونی چاہیے:

"اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ، وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ، وَلِسَانِي مِنَ الْكَذِبِ".

"اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو دکھاوے سے اور میری زبان کو جھوٹ سے پاک کر دے۔"

۱۴- مقصدیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے:

مکی سورتوں کا درس دیتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ اس کے ذریعے، عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت کو راسخ کرنا ہے۔ اللہ کی ذات اور صفات اس طرح واضح کرنا ہے کہ لوگ اُس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں اور اس کی رحمت کے امیدوار ہو کر جنت کے طلب گار بن جائیں۔ جذبۂ جہاد اور اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرنی ہے۔ لوگوں کو صبر و استقامت کی تلقین کرنی ہے اور مشکل حالات میں استقامت اور ثابت قدمی کے جذبات کو پروان چڑھانا ہے۔ دعوت کی مخالفت کے ماحول میں ہمت بلند رکھنی ہے۔ حیات بعد الموت اور ملاقاتِ رب کے تصور کو قلوب واذہان میں پختہ کرنا ہے۔

مدنی سورتوں کا درس (جیسا کہ قرآنِ مجید کا اسلوب ہے) معاشرت، معاملات اور عدلِ اجتماعی وغیرہ کے احکام کو آخرت کے عذاب و ثواب کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے دیجیے۔ لوگوں میں احکام پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامعین کو یہ تو یاد رہے کہ قرآن، یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین سے کیا کہتا ہے لیکن یہ سمجھ نہ آئے کہ قرآن خود ان سے کیا کہتا ہے؟

۱۵- حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیجیے:

شانِ نزول اور ربط پر (چند مخصوص مقامات کے علاوہ جہاں اس کے بغیر آیت کا سمجھنا ممکن نہیں) زیادہ زور نہ دیجیے۔ یہ نکات خواص کے لیے ہوتے ہیں۔ عوام کو تو قرآن کی ہدایت و نصیحت اور عبرت و موعظت کی ضرورت ہے۔ ان کے سامنے (مخصوص مواقع کے علاوہ) شانِ نزول بیان کرنے کے بجائے درسِ قرآن کے مضمون کو حالاتِ حاضرہ سے جوڑیے اور قرآن کریم کے تبصروں کو آج کی زمینی حقیقتوں پر منطبق کیجیے! لوگوں کو بتائیے کہ قرآن آج کے دن ہمیں کیا کہتا ہے؟ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پرانے دور کے کافروں کی سازشیں کیسی تھیں اور آج کے کافروں کی سازشیں کیسی ہیں؟ پرانے زمانے کے منافق کیسے تھے اور موجودہ دور کے منافق کیسے ہیں؟ پرانے دور کے مسلمان کیسے تھے اور ہم کیسے ہیں؟ ماضی کے طاغوت کون تھے اور اس دور کے طاغوت کون ہیں؟ لوگوں کو بتائیے کہ قرآن ان مشکل حالات میں ہمارے لیے کیا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے؟ یہ زندہ جاوید کتاب اس خلائی دور میں ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے؟ درسِ قرآن لوگوں کو جگانے والا ہو، خوابِ غفلت میں مبتلا کرنے والا نہ ہو۔ عمل کے لیے آمادہ کرنے والا ہو، محض سماع کی محفل نہ ہو۔

۱۶- اکتاہٹ نہ ہونے دی جائے:

مدرس، سامعین کی نفسیات کو ملحوظ رکھیے۔ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے (جو ہر جمعرات کو درس دیا کرتے تھے) درخواست کی کہ ہمیں روز نصیحت کیا کیجیے! آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں تمہیں روز تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لوگوں کے اکتا جانے کے خوف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دن نصیحت کے لیے مخصوص کر لیتے تھے۔"(۱)

۱- بخاری، کتاب العلم، باب ۱۱، حدیث ۶۸

اس لیے درس مساجد میں ہو، ہال میں یا کسی گھر میں، اس کی ترتیب ایسی بنائی جائے کہ لوگوں کی دلچسپی کم نہ ہونے پائے۔

۱۷- سوالات کا موقع دیجیے:

درس کے آخر میں حاضرین کو سوالات کا موقع دیجیے۔ اپنی بات سنانے کے بعد حاضرین کی بات سننے کا فن بھی سیکھیے۔ جب تک سامعین کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا تشفی بخش جواب نہ دیا جائے گا ان کی تسلی نہیں ہوگی اور درسِ قرآن کی نافعیت ادھوری رہ جائے گی۔ اس کی ترتیب یہ ہوسکتی ہے:

۱- پہلے درس کے متعلق براہ راست سوالات

۲- پھر عمومی دینی سوالات

۳- پھر محفل کے اختتام پر ہر سائل کو الگ الگ نجی سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔

یاد رہے کہ سوالات کے دوران محفلِ درس کا تقدس برقرار رکھنا کامیاب مدرس کی پہچان ہے۔ محفل کا تقدس پامال نہ ہونے دیجیے! حاضرین کو زبانی سوال کا موقع دینے کے بجائے پرچیاں تقسیم کیجیے! پرچی کے بغیر جواب نہ دیجیے! اس میں متعدد فوائد ہیں۔ جس پرچی کا جواب ذہن میں مستحضر نہ ہو اسے روک لیجیے اور اگلے دن (یا اگلے درس میں) مطالعہ و مراجعت کے بعد اس کا تسلّی بخش جواب دیجیے۔

مدرسِ قرآن کے لیے پانچ اہم ہدایات

درسِ قرآن سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مندرجہ ذیل پانچ اُصولی باتوں کا خیال رکھیے:

۱- نظمِ کلام کو ملحوظ رکھیے اور مرکزی مضمون تلاش کیجیے:

ہر سورت کا ایک عمود، یعنی مرکزی مضمون (Theme) ہوتا ہے۔ اِسی مرکزی مضمون کے اردگرد تمام آیات گھومتی ہیں، اسے تلاش کیجیے! مثلاً سورۃ البقرۃ کا مرکزی مضمون اِمامت کی تبدیلی ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کو دو ہزار پانچ سو سالہ اِمامت وقیادت سے معزول کر کے یہ ذمہ داری بنی اسماعیل یعنی امتِ مسلمہ کو دے دی گئی ہے۔ یا پھر سورۃ التین کا مرکزی مضمون اثباتِ قیامت ہے۔ ہر سورت کا ایک نظمِ جلی (Macro-Structure) ہوتا ہے۔ اس کو سمجھ کر سمجھانے اور دلوں میں اتارنے کی کوشش کیجیے۔

۲- سورت کے ہر لفظ کی انگلی پکڑ کر چلیے:

سورت کے ہر لفظ کی اُنگلی پکڑ کر چلیے! جیسے "وَالتِّیۡنِ" کے بعد "وَالزَّیۡتُوۡنِ" کیوں آیا ہے؟ "وَالزَّیۡتُوۡنِ" کے بعد "وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ" کیوں آیا ہے؟ اور "وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ" کے بعد " وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ" کیوں آیا ہے؟

ان چار چیزوں کا "لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ" سے کیا تعلق ہے؟

جب آپ لفظ کو لفظ سے جوڑنے کے فن پر مہارت حاصل کرلیں گے تو اس کے نتیجے میں نظمِ خفیف (Micro-Structure) کی دولت آپ کے ہاتھ آئے گی۔ یہاں انتہائی

عاجزی اور معذرت کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ ہماری برادری کے بیشتر فارغ التحصیل طلبہ اور طالبات صحیح ترجمہ کرنے کی صلاحیت تو حاصل کر لیتے ہیں، لیکن لفظ کو لفظ سے اور آیات کو آیت سے اور پیراگراف کو پیراگراف سے جوڑنے کے فن سے ناواقف رہتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا درس مقبول نہیں ہوتا، جبکہ پروفیسر، اسکالر اور ڈاکٹر حضرات اس چیز کا خیال رکھتے ہیں جو ان کے درس کی مقبولیت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ نظم قرآن کو سمجھنے کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر "بیان القرآن" بے نظیر و بے مثال ہے۔ اس میں حضرت نے جس طرح آیت سے آیت اور لفظ سے لفظ کا نظم سمجھایا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ اس کا کچھ عرصے مطالعہ رکھیں تو خود بخود اس فن کا ذوق اور ملکہ پیدا ہو جائے گا۔

۳- صفاتِ الٰہی پر غور کیجیے:

قرآن میں شروع سے آخر تک صفات الٰہی جا بجا پائی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام "الاسماءُ الحسنیٰ" (صفات پر مبنی حسین و جمیل نام) موتیوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

ان صفات الٰہی پر غور کیجیے کہ یہ مخصوص صفت اس خاص جگہ پر کیوں استعمال ہوئی ہے؟ مثلاً:

يَآاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا:

۱- لَاتَاۡ كُلُوۡا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بَالۡبَاطِلِ.

۲- اِلَّا اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ.

۳- وَلَا تَقۡتُلُوۡا اَنۡفُسَكُمۡ.

٤- اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا. (۱)

مندرجہ بالا آیت کو ہم نے آپ کی سہولت کے لیے چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱- النساء: ۲۰

غور کیجیے کہ ان چار حصوں کا آپس میں کیا ربط ہے؟

مندرجہ بالا آیت میں باطل تجارت کا باہمی رضامندی سے کیا تعلق ہے؟ اور باطل تجارت کا "وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ" سے کیا تعلق ہے؟

مندرجہ بالا آیت کے آخر میں "رحیم" کی صفتِ الٰہی کیوں استعمال کی گئی ہے؟

٤- قرآن کے "اِنذار وتبشیر" پر ہمیشہ نظر رکھیے:

قرآن کتابِ اِنذار بھی ہے اور کتابِ تبشیر بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا۔ قرآن دنیاوی کامیابیوں اور اُخروی اور ابدی فلاح وفوز کی بشارت بار بار دیتا ہے اور دنیاوی ناکامیوں اور اُخروی اور ابدی عذابِ جہنم سے بار بار ڈراتا ہے تاکہ لوگ صحیح عقیدہ، صحیح طرزِ عمل، صحیح رویے اور اعمالِ صالحہ اختیار کر لیں۔ یہ بات مدرسِ قرآن ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔

قرآن کریم کی عبرت وموعظت اور حکمت وہدایت کو سمجھنے کے لیے عربی میں ابوبکر جابر جزائری کی 'ایسر التفاسیر' اور اردو میں مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی 'تسہیل البیان' بہت مفید ہیں۔

٥- مقصد پر نگاہ رکھیے، غیر ضروری تفصیلات سے بچیے:

مدرسِ قرآن کو چاہیے کہ وہ مقصد پر نگاہ رکھے اور غیر ضروری تفصیلات سے بچے۔ قرآن شروع سے آخر تک، اپنی ہر بات کو زیادہ تر اُخروی جزا وسزا کے ساتھ جوڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ نظر میں رکھیے۔ قرآن کی نگاہ غیر ضروری تفصیلات سے زیادہ مقاصد اور تزکیے پر ہوتی ہے۔ اصحابِ کہف کی تعداد اور ان کے غار کے محل وقوع وغیرہ کے متعلق مختلف اقوال سے آخر کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ان چیزوں میں لگ کر قرآن کا اصل پیغام نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

٦- قرآن کے دلائل سے حاضرین کو قائل کیجیے:

قرآن ایک کتابِ دلائل ہے۔ ایک غیر مسلم اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو آپ دلیلوں کے ذریعے ہی قائل کر سکتے ہیں۔ داعی، مُبلّغ اور مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح کرے۔ دلائل کے بغیر آپ دعوت کے میدان میں اتریں گے تو آپ پر یہی پھبتی کسی جائے گی کہ ؎

اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

قرآن، خود قرآن پر کیے جانے والے اعتراضات کو نقل کرتا ہے اور جوابی دلائل فراہم کرتا ہے۔ عقیدۂ توحید پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کو نقل کر کے شافی جوابات دیتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منکرین نے ساحر، کاہن، مفتون، مجنون، مفتری، معلّم وغیرہ جیسے القابات سے نوازا۔ قرآن نے ان سب کا جواب دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر اعتراض وارد کیا گیا۔ حِسّی معجزات کا مطالبہ کیا گیا۔ ان سب کا مُسکِت جواب فراہم کیا گیا۔

قرآن کے عقیدۂ آخرت پر بے شمار سوالات اُٹھائے گئے۔ قرآن نے ان سب کا مقابلہ کیا۔ دلائل کے لیے آیۃ (جمع آیات) کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ آیۃ سے مراد Sign, indicator, Guide, Lead ہے۔ یعنی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے حقیقت کا سراغ (Clue) ملتا ہے۔ قرآنی دلائل عقلی بھی ہیں اور نقلی بھی۔ آفاقی بھی ہیں اور انفسی بھی۔ بعض اوقات تاریخی دلائل سے بھی کام لیا گیا ہے۔

مدرسِ قرآن کو چاہیے کہ جب وہ "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰ یَۃً" یا اس جیسی ملتی جلتی آیات سے گزرے تو دو چیزوں کو ڈھونڈے۔

۱- اس مقام پر دلیل کی نوعیت کیا ہے؟ عقلی ہے، نقلی ہے، آفاقی ہے، انفسی ہے یا تاریخی؟

۲- اس مقام پر دلیل کا مقصد کیا ثابت کرنا ہے؟ اللہ کی وحدانیت، قدرت، قانونِ رسالت یا آخرت یعنی زندگی مابعد موت یا کوئی اور چیز؟

سائنسی دلائل:

یہ دور سائنس کا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کی مدد سے بھی قرآن میں بیان کردہ آفاقی، انفسی اور تاریخی دلائل کو مزید واضح کیا جاسکتا ہے۔ البتہ مدرسِ قرآن پر دو چیزیں بالکل صاف ہونی چاہییں:

۱- قرآن کلامِ الٰہی ہے اور ابدی اور حتمی صداقتوں (Ultimate Truth) پر مبنی ہے۔ جب کہ سائنس حقیقت کے سراغ میں ایک محدود انسانی سفر کا نام ہے۔ سائنس بدلتی رہتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ جب کہ قرآن کبھی نہیں بدل سکتا اور نہ ہی قرآن کی کوئی بات غلط ثابت ہوسکتی ہے۔ سائنس کی اس حقیقت سے ناواقف اور دورِ جدید سے مرعوب حضرات قرآنِ مجید کی الٹی سیدھی تفسیر کرنے لگتے ہیں۔

۲- طالبِ قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنس کی ثابت شدہ کلیات (Proven Facts) کو محض نظریات (Theories) سے الگ کرکے دیکھے۔ سائنس کی ہر بات پر ایمان نہ لائے۔ ڈاروَن کے باطل نظریات کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

حلفی دلائل:

قرآن مجید میں جو جا بجا قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ بھی دلائل یا آیات ہی کی ایک دوسری صورت ہیں۔

قرآنِ مجید میں لیل، نہار، تین، زیتون، عصر، فجر، ضحیٰ، عادیات، مرسلات وغیرہ کی

قسمیں کھائی گئی ہیں۔ یہ ساری قسمیں کسی نہ کسی حقیقت، قاعدے اور کلیے کو ثابت کرنے کے لیے کھائی گئی ہیں۔ مدرسِ قرآن کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ مُقسَم بہٖ (جس کی قسم کھائی گئی ہے) اور مُقسَم عَلَیہِ (جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے) کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے و العصر کا خسارے سے گہرا تعلق ہے۔ و العصر کی جگہ و الفجر نہیں رکھا جا سکتا۔

"سورۃ یٰسٓ" کے آغاز میں حکمت والے قرآن کی گواہی اس لیے پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی سمجھ کر ایمان لائیں۔

"سورۃ الانشقاق" میں شفق، رات اور چاند کی گواہیاں اسی لیے پیش کی گئی ہیں تاکہ ثابت کیا جا سکے کہ انسان کو بھی مندرجہ بالا تین چیزوں کی طرح ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف سفر کرنا ہے۔ وہ کشاں کشاں، چاہے نہ چاہے اپنے رب کی طرف سفر کر رہا ہے۔

"سورۃ الطارق" میں زمین اور آسمان کی قسم یعنی گواہی اسی لیے فراہم کی گئی ہے کہ جس طرح آسمانی بادو باراں کے فیض سے زمین پھٹ کر لہلہانے لگتی ہے اسی طرح قرآن کے فیض سے بھی انسانی روحیں سیراب ہوں گی۔ قرآنِ مجید قولِ فیصل ہے، سنجیدہ کلام ہے، ہنسی مذاق نہیں۔

ایک منکرِ خدا، ایک منکرِ رسالت اور ایک منکرِ آخرت کو آپ اُن دلیلوں ہی سے مطمئن کر سکتے ہیں جن کا وہ خود مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور جن کا وہ خود قائل ہوتا ہے۔

جنت اور دوزخ کا مقصد جزا وسزا (Reward and Punishment) ہے۔ جزا وسزا کے اس الٰہی قانون کو زمین، آسمان، بجلی، ہوا، بارش، سمندر وغیرہ کی آفاقی دلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے، جو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ موجود ہیں۔

درسِ قرآن کے لیے وقت کی تقسیم

درج ذیل جدول پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ درسِ قرآن کے دورانیے کو کس طرح مختلف امور کے لیے تقسیم کیا گیا ہے؟ اور ہر حصے کے لیے کتنا وقت تجویز کیا گیا ہے؟

نمبر شمار	عنوان	وقت	تفاصیل
١	تلاوت	٣ منٹ	موضوع سے متعلق جامع آیات کی ترتیل، تجوید اور حُسن صوت سے تلاوت
٢	ترجمہ	٣ منٹ	کلامِ الٰہی کے شایانِ شان رواں، اَدَبی اور معیاری
٣	خلاصۂ موضوع	١ منٹ	نہایت اختصار سے خلاصہ بیان کرنا
٤	اصل موضوع پر گفتگو	٣٠ منٹ	شائستہ، بامعنی اور مقصدیت سے بھرپور
۵	خلاصۂ کلام	٢ منٹ	حاصلِ موضوع کا اعادہ
٦	ہمارے لیے پیغام	۵ منٹ	سبق، عبرت اور دعوت، دورِ حاضر پر تطبیق
٧	اختتامی کلمات	١ منٹ	دعوت میں تاثیر اور خطیب و سامعین کی اصلاح کے لیے اللہ سے استعانت
٨	سوال و جواب	١٠ منٹ	موضوع سے متعلق، عام، نجی
	کل وقت	۵۵ منٹ	

تنبیہ: عام لوگوں کے لیے درسِ قرآن کا دورانیہ (بشمول سوال و جواب) کسی صورت میں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

درس قرآن کی دو قسمیں اور ان کا طریقہ

درس قرآن کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کسی مخصوص سورت یا رکوع کا درس چاہے اس میں ایک سے زیادہ موضوع زیر بحث آئیں۔

(۲) کسی ایک موضوع یا عنوان پر مختلف مقامات سے لی گئی آیاتِ قرآنیہ کا درس، مثلاً مومنینِ کاملین کے اوصاف، منافقین کی علامات، عورتوں کے حقوق، جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔

مخصوص سورت یا رکوع کے درس کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھیے:

۱ - تلاوت:

مُدَرِّس، درس کا آغاز مختصر خطبہ اور تلاوت سے کرے۔ آواز میں ترنم ہو تو اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کو دین کی دعوت میں دلکشی اور اور تاثیر پیدا کرنے کے لیے خوب خوب استعمال کریں۔

مُدَرِّسِ قرآن کو چاہیے کہ وہ کسی ماہرِ فن قاری سے تجوید کی مشق کر لے اور ترتیل، تجوید اور ممکنہ حد تک حُسنِ صوت کے ساتھ تلاوت کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"لَيۡسَ مِنَّا مَنۡ لَّمۡ يَتَغَنَّ بِالۡقُرۡآن". (۱)

" وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو اچھی آواز کے ساتھ قرآن نہیں پڑھتا۔"

۲ - ترجمہ: قرآن کا ترجمہ کلامِ الٰہی کے شایانِ شان ہو۔ زوردار ہو اور مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے والا ہو۔ ترجمے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیے:

۱ - ترجمہ معیاری ہو، لفظی نہ ہو۔

---

۱ - بخاری، کتاب التوحید، باب ٤٤، حدیث ٧٦٢١

۲- ترجمہ اَدَبی اور شائستہ زبان میں ہو۔ اچھی زبان مہذب اور شائستہ ہونے کی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بازاری گفتگو یا غیر معیاری محاورہ نہیں سنا گیا۔

متروک الفاظ استعمال نہ کیجیے۔ جیسے: تلک، ہووے، وغیرہ۔

ثقیل اور نامانوس الفاظ یا پیچیدہ تراکیب واستعاروں سے گفتگو کو بوجھل نہ بنائیے۔

جیسے: جز ولاینفک، دقیقہ فروگذاشت، دادودہش، امتثالِ اوامر، منکرات پر نکیر۔

۳- ترجمہ رواں ہو، تاکہ سامعین تک بنیادی بات پہنچ جائے۔ مثلاً: "قَالَ مُوسٰی لِقَومِهٖ" کا ترجمہ یوں نہ کیجیے:

" کہا، موسیٰ علیہ السلام نے، قوم سے اپنی" بلکہ اس طرح کیجیے:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔"

یادرکھیے! ایک زبان کا حسنِ ترتیب، دوسری زبان میں عیب بن جاتا ہے۔ تعقید، فہم میں حائل ہوتی ہے۔ دینی مدارس میں اساتذۂ کرام ابتدائی عربی سیکھنے والے طلبہ کو نحوی، صرفی تحلیل اور لغوی تحقیق کے ساتھ جس طرح ترجمہ پڑھاتے ہیں، وہ مبتدی طلبہ کو زبان سکھانے کے لیے ہے۔ عوام کے سامنے اس طرز سے مکمل اجتناب کیا جائے، اس لیے کہ آپ کے سامعین صرف ونحو سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ انہیں مضمون اور پیغام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

حال ہی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا "آسان ترجمۂ قرآن" شائع ہو چکا ہے۔ اس میں وہ عام خوبیاں ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور یہ ان تمام خامیوں سے مبرّا ہے جن سے بچنے کی اوپر تلقین کی گئی۔

٤- ترجمہ بآوازِ بلند پڑھا جائے تاکہ سامعین پر کلامِ الٰہی کی ہیبت اور اس کا دبدبہ طاری ہوجائے۔

۳- پسِ منظر:

پسِ منظر، زمانہ اور شانِ نزول پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔ یہ چیزیں مطالعے سے تعلق رکھتی ہیں۔ درسِ قرآن کا مختصر وقت اس قسم کی تفصیلات کا مُتحمّل نہیں ہو سکتا۔ پسِ منظر کا ذکر صرف اتنا کیا جائے جتنا بات سمجھانے کے لیے ضروری اور ناگزیر ہو۔ قرآن کو ایک زندہ کتاب کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شانِ نزول اور ربط پر زیادہ وقت صرف کرنے کے بجائے پیغامِ قرآنی اور عملی سبق پر زور دیا جائے۔ حالاتِ حاضرہ پر تطبیق کی جائے۔ سامعین کو محسوس ہو کہ قرآن کریم ہمارے گرد و پیش کے متعلق ہم سے ناصحانہ اور راہ نما گفتگو کرتا ہے۔

٤- مرکزی مضمون (عمود):

مرکزی مضمون یا عمود (Theme) دراصل وہ بنیادی موضوع ہے جس کے ارد گرد ساری سورت گھومتی ہے۔ اگر آپ کسی طویل سورت کے ایک مخصوص پیراگراف یا مخصوص رکوع کا درس دینا چاہتے ہیں تو آپ اس پیراگراف اور اس رکوع کے مرکزی مضمون کا تعین کیجیے۔

مثلاً "سورۃ التین" کے سلسلے میں آپ یہ بتائیں گے کہ اس سورت کا مرکزی مضمون

۱- "قیامت کے امکان کا جائزہ" یا

۲- "قیامت کے امکان پر دعوتِ فکر" یا

۳- "امکانِ قیامت کے عقلی اور نقلی دلائل" ہے۔

چنانچہ اس سورت کا اختتام "دو سوالات" پر ہوا ہے، تا کہ انسان اس سورت پر غور و فکر اور تدبر کے بعد ان دونوں سوالوں کا اثباتی جواب دے سکے۔

۵- مشکل الفاظ کی تشریح:

مشکل الفاظ کی تشریح کے لیے امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ کی "مفردات القرآن"

کو بنیاد بنایا جائے۔مختلف تفاسیر سے بھی مشکل الفاظ کے معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ملتے جلتے الفاظ اور مفاہیم کے لیے مولانا عبدالرحمٰن کیلانی کی کتاب " مترادفات القرآن "مفید ہے۔یہ دونوں کتابیں آپ کے پاس ہونی چاہییں۔

٦- آیات کی تفسیر:

اب آپ ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تشریح کرتے جائیے۔آیات کے باہمی ربط کی وضاحت کیجیے۔طویل آیت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے باہمی ربط کی وضاحت کیجیے۔فوائد و نکات اور لطائف و معارف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ درج ذیل چار چیزوں سے استفادہ کیجیے۔

١- آیات:

آیات کی وضاحت کے لیے قرآن کی دیگر آیات پیش کیجیے جو اس موضوع اور مضمون سے " براہِ راست "متعلق ہوں تاکہ " تفسیرُ القرآن بِالقرآن " کا حق ادا ہو جائے۔

٢- احادیث:

آیات کی وضاحت کے لیے موضوع سے "براہِ راست " متعلق صحیح اور حسن احادیث پیش کیجیے۔ضعیف اور موضوع احادیث سے گریز کیجیے۔

٣- سیرتِ صحابہ:

موضوع سے متعلق سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا سیرتِ صحابہ وسلف سے کوئی " سچا واقعہ " پیش کیجیے۔قرآن کتابِ حق ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں۔قرآن وسنت اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصنوعی رنگ کے محتاج نہیں۔واقعات میں نمک مرچ لگانے کی کوشش نہ کیجیے۔

٤- اسوۂ اسلاف:

آپ کے پاس اکابر امت کے سچے واقعات، تابعین کی حکایات، بزرگان دین سے منقول لطائف و معارف اور اقوال قصص پر مشتمل مستند مواد موجود ہونا چاہیے جسے آپ وقتاً فوقتاً اپنے دروس میں استعمال کر سکتے ہیں۔

۷- وقت کی پابندی:

وقتِ مقررہ میں منتخب آیات کی یا سورت کی آخری آیت تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ کسی نکتے کو اتنا نہ کھینچیے کہ بعد میں آپ کو وقت کی کمی کا احساس ہو اور آخر میں آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں، افسوس! اصل بات تو کہی نہیں جا سکی۔

۸- موضوع سے وابستگی:

بعض اوقات مدرّسین بہت دور نکل جاتے ہیں۔ آپ آیت کے آس پاس ہی رہیے۔ کسی نکتے کی وضاحت کے لیے اگر دور جانا پڑے تو فوراً لوٹ کر آیت کے اصل مضمون کی طرف آ جایئے۔

یاد رہے کہ ہر تفسیر کی ہر بات کو اپنی کاپی پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ دوران مطالعہ جو کچھ آپ نے تفاسیر میں پڑھا ہے وہ سب کا سب دہرانے کی حاجت۔ مثلاً بعض تفاسیر میں نحوی بحثیں ہوتی ہیں اور بعض میں فقہی اجتہادات ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض تفاسیر میں مختلف قراءتوں کی تفاصیل اور صوفیانہ رموز و اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کا عوام الناس کے سامنے رکھنا مناسب نہیں۔ آپ کے سامنے صرف دعوتی پہلو نمایاں رہنا چاہیے جس کے نتیجے میں لوگوں کے عقائد و اخلاق اور عملی زندگی میں انقلاب برپا ہو جائے۔

۹- خلاصۂ کلام:

دو منٹ کے اندر پورے مضمون کا خلاصہ یعنی حاصلِ مضمون لوگوں کے سامنے

رکھیے۔ دراصل یہ مرکزی مضمون/عمود (Theme) کا اعادہ ہوگا۔

۱۰- ہمارے لیے پیغام

خلاصے کے بعد لوگوں کو یہ بتائیے کہ اس مضمون میں میرے اور آپ کے لیے کیا پیغام ہے؟ اور ان ہدایات کی روشنی میں ہم اپنے باطن اور اپنے ظاہر کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں؟ معاشرے میں کون سی تبدیلیاں ناگزیر ہیں؟ خدائی ہدایات کی روشنی میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

☆.......☆.......☆

اختتامی کلمات:

درسِ قرآن کا اختتام دعائیہ کلمات پر کیجیے۔

ان میں توبہ و استغفار، صراط مستقیم پر استقامت، فہم و عمل بالقرآن کی توفیق اور جہاد فی سبیل اللہ بالنفس والمال اور خاتمہ بالخیر کے متعلق دعائیہ کلمات کہیے۔ اس سے لوگوں کی ذہن سازی ہوتی ہے اور وہ آخری تاثر اچھا لے کر اٹھتے ہیں۔

موضوعاتی درس کی تیاری

موضوعاتی درسِ قرآن کی تیاری کے مراحل:

موضوعاتی درسِ قرآن کی تیاری، کسی مخصوص سورت کے درس کی تیاری سے نہ صرف مختلف ہوگی بلکہ نسبتاً ذرا سی مشکل بھی۔ موضوعاتی درس کے لیے آپ کو مختلف مرحلوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جن کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے۔

پہلا مرحلہ۔موضوع کا انتخاب:

موضوع کا انتخاب پہلا مرحلہ ہے۔ موضوع کے انتخاب میں وقت، حالات، جگہ اور سامعین کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ نیز درج ذیل اصول ملحوظ رکھیے:

۱ - موضوع زندہ ہو، مردہ نہ ہو:

درسِ قرآن کا موضوع زندہ ہو، مردہ نہ ہو۔ مثلاً "دعوت دین کے حوالے سے امت مسلمہ کی ذمہ داریاں" یا "عصرِ حاضر کے طاغوت" ایک زندہ موضوع ہے لیکن "خوارج کے عقائد" یا "یونانی فلسفہ اور اس کی تردید" سے ہمارے دور کے عوام کی دلچسپی کیا ہوسکتی ہے؟

۲ - موضوع عملی ہو، صرف نظری نہ ہو:

موضوع عملی ہو، صرف نظری نہ ہو مثلاً: عفو و درگذر" کا موضوع اتنا اہم ہے کہ اس کے ذریعے سے ہم اپنے معاشرے میں موجود بے شمار خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ دو بھائیوں کو ملا سکتے ہیں۔ دو برادریوں کو جوڑ سکتے ہیں۔ جب کہ ایسے موضوعات جو

صرُف نظری ہوں اور جن کی عملی افادیت نہ ہو ان سے بگاڑ یا بیزاری کا اندیشہ ہی لگا رہتا ہے۔

۳- موضوع تعمیری اور اصلاحی ہو، تخریبی نہ ہو:

درسِ قرآن کا موضوع تعمیری اور اصلاحی ہو، تخریبی نہ ہو۔ جیسے: "سمع وطاعت" کا موضوع ایک تعمیری موضوع ہے۔ جبکہ "صفات الٰہیہ" کا موضوع درسِ قرآن کی محفل کے لیے مناسب نہیں جو شخص اس بارے میں جاننا چاہتا ہو اُسے کتابیں فراہم کی جاسکتی ہیں یا پھر متعلقہ آیات کے حوالے دیے جاسکتے ہیں تا کہ وہ اس پر غور کر سکے۔

٤- موضوع پرانا بھی ہوسکتا ہے اور نیا بھی:

درسِ قرآن کا موضوع پرانا بھی ہوسکتا ہے اور نیا بھی۔ نسل کشی اور فیملی پلاننگ کے موضوعات پرانے زمانے میں جتنی اہمیت کے حامل تھے وہ اس دورِ جدید میں بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا موضوع کسی دور میں بھی بوسیدہ نہیں ہوسکتا۔

٥- مُتَشَابِهَات کو موضوع نہ بنائیے:

قرآن کی آیاتِ مُتَشَابِهَات کو موضوع نہ بنائیے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "محکم آیات" بھی نازل کی ہیں اور "متشابہ آیات" بھی۔ درسِ قرآن کا موضوع "محکم آیات" پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مُتَشَابِهَات کی تاویل سے گریز کیجیے۔ قرآن کہتا ہے:

"فَاَمَّاالَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ"[1]

"جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، ہمیشہ مُتَشَابِهَات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّا هُمُ اللّٰهُ، فَاحْذَرُوْهُمْ."[2]

"وہ لوگ جو مُتَشَابِہ آیات کے پیچھے پڑتے ہیں، انہیں کا اللہ نے نام رکھا ہے۔

۱- آل عمران: ۷

۲- بخاری، کتاب التفسیر آل عمران، باب ۱، حدیث ٤٥٨٩

ان سے بچو!"

یہ بات ہر صاحب فہم مسلمان پر (جو عقلِ عام رکھتا ہے) بالکل واضح ہوتی ہے کہ درسِ قرآن اور دعوتِ اسلام کے لیے صحیح عقائد، اَحوالِ قیامت، اَحوالِ جنت و دوزخ، بیّنات، عبادات، معروف و منکر، فرائض و واجبات، اَخلاقیات اور معاملات کے احکام، اجتماعی زندگی کے فوائد اور اسلام کے عائلی اور اجتماعی نظام کی برکات جیسے موضوعات ہی اہمیت رکھتے ہیں۔

عوام الناس کو وَجْـــہ (اللہ کا چہرہ) یَـد (اللہ کا ہاتھ) حروفِ مقطعات اور دیگر متشابہات پر مبنی موضوعات کا چسکا لگانا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

دوسرا مرحلہ-منتخب موضوع کے لیے مناسب آیات کی تلاش:

۱- موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد آپ اس موضوع پر لکھی گئی مختلف پرانی اور نئی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ "ہر کتاب کی ہر بات اور ہر مصنف کا ہر نکتہ "بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲- مختلف کتابوں سے جو نوٹس آپ لیتے ہیں اس میں اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ جو بات بلاحوالہ (Matter Without Sound Reference) ہے، اس کو نہیں لینا ہے۔

۳- قرآن کریم کی جو معیاری سی ڈیز دستیاب ہوں ان میں سے سرچ کر کے متعلقہ آیات منتخب کیجیے۔

٤- بیان القرآن دیکھیے کہ کیا اس میں آپ کے انتخاب کردہ موضوع سے متعلق عنوان ہے یا نہیں؟ ہو تو متعلقہ آیات نوٹ کر لیجیے؟

موضوعِ درس قرآن "اطاعت":

٤- فرض کیجیے آپ نے "اطاعت" کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس سلسلے میں مختلف سی ڈیز کی سرچنگ، کتابوں کے مطالعے اور انڈیکس کی مدد سے کچھ آیات نوٹ کر لی ہیں۔

اس کے بعد محمود فواد عبد الباقی کی "المعجم المفہرس" سے اطاعت اور اس سے متعلقہ دیگر الفاظ مثلاً: مُطاع (جس کی اطاعت کی جائے) مُطیع (اطاعت کرنے والا) وغیرہ وغیرہ الفاظ پر مشتمل تمام آیات مع ترجمہ ایک کاغذ پر لکھتے جایئے۔ ہر مدرس کے پاس "المعجم المفہرس" کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

۵- اب مفردات القرآن (امام راغب) سے (ط و ع) کے مادے سے نکلنے والے مختلف الفاظ کے معنی نوٹ کر لیجیے اور اطاعت کے مختلف استعمالات دیکھ لیجیے۔ اس کتاب کا ہر مدرسِ قرآن کے پاس ہونا ضروری ہے۔

تیسرا مرحلہ- ہر نکتے اور ہر مضمون کو عنوان دیجیے:

۱- الگ الگ کاغذ پر یا کارڈز (Cards) پر آپ کے پاس کئی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے ترجمے پر اچھی طرح غور کیجیے اور نہایت عرق ریزی سے کام لے کر ہر آیت یا ہر آیت کے ٹکڑے کا الگ الگ عنوان دیتے جائیں۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیجیے۔ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" کے مصداق آپ پر بے شمار نئے آفاق کا انکشاف ہوگا۔ "عنوانات" آپ کے اس "کشف" کے پورے پورے آئینہ دار ہوں۔

۲- احادیث کے کسی مستند مجموعے سے جس میں صحیح روایات کا التزام کیا گیا ہو۔ "اطاعت" کے موضوع پر احادیث کا انتخاب کر کے الگ الگ کاغذ یا الگ الگ کارڈ پر لکھتے جایئے۔

۳- ان احادیث پر غور و فکر کے بعد ان کو مناسب عنوان دیجیے جس طرح آپ نے پہلے ہر آیت یا آیت کے ٹکڑے کو عنوان دیا تھا۔

٤- اسی موضوع سے متعلق سیرت صحابہ و سلف سے کوئی سچا اور مستند واقعہ تلاش کیجیے۔ "دارُالمصنفین" نے "سیرتُ الصحابة رضی الله عنهم" کے نام سے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کا آپ کے پاس ہونا بہت مفید ہے۔

چوتھا مرحلہ-مختلف تفاسیر سے مراجعت:

موضوع کا انتخاب ہوگیا، متعلقہ آیات تلاش کرلی گئیں، صحیح احادیث اکٹھی کرلی گئیں، عنوان سازی ہوگئی، اب آپ کے پاس کافی مواد جمع ہوگیا ہے۔

۱- سی ڈیز، المعجم المفھرس اور بیان القرآن کی فہرست سے حاصل شدہ آیات ہیں۔

۲- مفردات القرآن کی توضیحات ہیں۔

۳- مستند صحیح احادیث ہیں۔

٤- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے واقعات اور سلف سے منقول حکایات وامثال ہیں۔

مندرجہ بالا عناصر کی روشنی میں آپ غور وفکر کے بعد عنوانات قائم کرچکے ہیں لیکن آپ کو خدشہ ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ چنانچہ متعلقہ آیات کی تفسیر اور تشریح کے لیے آپ مختلف تفاسیر سے رجوع کریں گے۔ جس کے نتیجے میں آپ:

i- بعض عنوانات کے الفاظ بدل دیں گے۔

ii- بعض عنوانات میں جزوی ترمیم کریں گے۔

پانچواں مرحلہ-ترتیب (Proper Sequencing):

عنوانات کی تنقیح کے بعد آپ کے لیے اگلا مرحلہ "مناسب ترتیب" یعنی Proper Sequencing کا ہے۔

کون سا کارڈ پہلے ہو؟ کون سا بعد میں؟ ان میں منطقی ربط کیسے پیدا کیا جائے؟

تمام کارڈز یا کاغذات کو اپنے سامنے پھیلا دیجیے۔ ذیلی عنوانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کارڈز (Cards) کو مختلف گروپس میں تقسیم کرلیجیے اور ہر کارڈ پر ترتیب وار نمبر ڈالنا شروع کردیجیے۔ آپ کا موضوع اطاعت ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ:

......کچھ ہستیوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

......کچھ ہستیوں کی اطاعت سے روکا گیا ہے۔

......کچھ آیات میں اطاعت کے عمومی اصول بتائے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ جن لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ان کے مختلف درجات ہیں:

کسی کی مطلق (Absolute) اطاعت کرنے کا حکم ہے؟

کسی کی مشروط اور مقید اطاعت (Conditional) کرنے کی صراحت ہے؟

اب آپ درجہ بندی کرتے جایئے:

☆ اللہ کی اطاعت ☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

☆ امیر کی اطاعت ☆ والدین کی اطاعت

☆ شوہر کی اطاعت ☆ علماء کی اطاعت وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد ترتیب وار اُن لوگوں کا ذکر ہوگا جن کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے۔

اس مقام پر آپ کو احساس ہوگا کہ میرا کام ۶۰ فیصد سے زیادہ مکمل ہو چکا ہے۔

ترتیب کا بھی ایک "ابتدائی ڈھانچہ" بن چکا ہے۔

چھٹا مرحلہ - ابتدائی خاکے کی تیاری:

اگلا مرحلہ ابتدائی خاکے (Initial Outline) کا ہے۔

۱- اطاعت کے بارے میں اصولی اور بنیادی باتیں۔

۲- کس کی اطاعت کی جائے؟

۳- اطاعت کی قسمیں

i- غیر مشروط مطلق اطاعت

ii-- مشروط ومقید اطاعت

iii-- مشروط اطاعت، شرطیں اور قیود

٤- کس کی اطاعت نہ کی جائے؟

٥- جن کی اطاعت ممنوع ہے اس کے عواقب اور نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟

٦- موجودہ منتشر معاشرے کا جائزہ، انفرادی اور اجتماعی اطاعت، کیا یہ ایک منظّم اور مربوط معاشرہ ہے؟ کیا اس کو نظم اور اطاعت کے نظام کی ضرورت ہے؟

٧- آیندہ لائحۂ عمل، قوم کی راہنمائی اور دعوت قرآن وسنت کی روشنی میں حل، لوگوں کے لیے پیغام۔

آپ کا ٦٠، ٧٠ فیصد کام مکمل ہو چکا ہے۔

ساتواں مرحلہ- اہلِ علم سے مراجعت:

اس موقع پر آپ کو یہ احساس ہوگا کہ بعض آیات پوری طرح واضح نہیں ہوسکیں۔ اس کے لیے آپ کو تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑے گا (صرف متعلقہ آیات کی تفسیر)

١- مزید کتبِ حدیث وفقہ سے رہنمائی کی ضرورت ہے۔

٢- کسی زیادہ جاننے والے کی مدد کی ضرورت ہے جس کے لیے اس سے ملاقات کی جاسکتی ہے، یا فون پر بھی معلوم کیا جاسکتا ہے تاکہ وقت کی بچت ہو اور تاکہ آپ اس مرحلے سے گزر کر اور اطمینان بخش جوابات کے حصول کے بعد دوبارہ اپنے نوٹس کا جائزہ لے سکیں۔

اس عمل کے بعد:

☆ شاید آپ کو بعض عنوانات بدلنے پڑیں گے۔

☆ بعض عنوانات کی ترتیب بدلنی پڑے گی۔

☆ بعض چیزوں کا اضافہ کرنا پڑے گا۔

☆ بعض غیر متعلقہ چیزوں کو حذف کرنا پڑے گا۔

☆ اب آپ ۸۰، ۹۰ فیصد تیاری مکمل کر چکے ہیں۔

آٹھواں مرحلہ- ایڈیٹنگ (Editing):

اب ایک اور مرحلہ درپیش ہے اور وہ ہے ایڈیٹنگ (Editing) کا۔

لیکن اس سے پہلے آپ کو چند چیزوں کا جائزہ لینا ہے۔

☆ یہ درس کس لیے ہے؟ ☆ سامعین کون ہیں؟

☆ یہ درس کہاں ہوگا؟ ☆ کب ہوگا؟

☆ درس کا دورانیہ کیا ہوگا؟ ☆ مطلوب کیا ہے؟

☆ الفاظ اور زبان کے لیے متبادلات پر غور کیجیے۔

☆ تکرار کو حذف کر دیجیے۔

☆ اہم چیز کو مناسب مقام اور جگہ فراہم کیجیے۔

☆ غیر اہم کا وقت کم کیجیے۔ ان کی تفاصیل کو حذف کر دیجیے۔

☆ ہر نکتے کے لیے ماقبل اور مابعد سے ربط تلاش کیجیے۔

آپ نے ۹۵ فیصد کام مکمل کر لیا۔

آخری مرحلہ- موضوعاتی درس کا حتمی خاکہ:

آپ نے ایڈیٹنگ (Editing) یعنی حذف و اضافے اور ترتیب کا کام مکمل کر لیا ہے۔ الحمدللہ! اللہ کا شکر ادا کیجیے۔

اب خدا کا نام لے کر حتمی خاکے (Final outline) کو لکھ لیجیے۔

موضوع، اطاعت، حتمی خاکہ:

۱ - تلاوت:

تلاوت کے لیے ایک ایسی جامع آیت کا انتخاب کیجیے جس میں تمام قسم کی اطاعتوں کا خلاصہ ہو۔ مثلاً:

" اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ". (۱)

۲ - ترجمہ:

حسبِ ہدایاتِ سابقہ ترجمہ معیاری ہونا چاہیے۔

۳ - خلاصۂ موضوع:

آج ہم جائزہ لیں گے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں " اطاعت " کیا ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ کون سی اطاعت غیر مشروط ہے اور کون سی مشروط؟ کون سی فرض ہے اور کون سی حرام؟ کیا ہم سمع وطاعت کے نظام کے بغیر دنیا میں باعزت زندگی گزار سکتے ہیں؟

٤ - اصل موضوع پر گفتگو مع تفصیل وتشریح:

☆ گفتگو کا ڈھانچہ (Structure)

☆ اطاعت کا حکم، قرآن میں

☆ اطاعت کا حکم، احادیث میں

☆ عدمِ اطاعت کی سزائیں:

اطاعت نہ کرنے پر دنیاوی سزا بھی ملے گی اور اُخروی سزا بھی۔ قرآن کہتا ہے:

۱ - عدمِ اطاعت کی دنیاوی سزا، مسلمانوں کی ذلت اور ان کے دبدبے کا خاتمہ ہے۔

" فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ " (۲)

"ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

---

۱ - النساء: ۵۹

۲- عدمِ اطاعت کی اُخروی سزا دوزخ کی آگ ہے۔

"یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا" (۱)

"جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے "کاش! ہم نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ہوتی۔"

۱- الاحزاب: ٦٦

☆کس کی اطاعت کی جائے؟:

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم بار بار قرآن میں آیا ہے۔ اولوالامر (خلفاء، حکمران) کی اطاعت کا حکم سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۹ میں بیان ہوا ہے۔ گھر کا سربراہ شوہر ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے قَوَّام کے خطاب سے نوازا ہے اور بیویوں کو اُن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ والدین کی اطاعت اوران سے حُسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ سمع وطاعت کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

☆کس کی اطاعت نہ کی جائے؟:

قرآن میں بے شمار آیات ایسی ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بعض مخصوص افراد اور بعض مخصوص صفات رکھنے والے اشخاص کی اطاعت سے منع کیا ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیے:

۱ - کافروں کی اطاعت نہ کی جائے۔

" فَلَاتُطِعِ الْكَافِرِيْنَ". (۱)

۲ - منافقین کی اطاعت نہ کی جائے۔

"وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ". (۲)

۳ - مکذبین کی اطاعت نہ کی جائے۔

" فَلَاتُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ". (۳)

٤ - مسرفین (فسادی افراد کی) اطاعت نہ کی جائے۔

" وَلَاتُطِيْعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ". (٤)

---

۱ - الفرقان: ۵۲ ۲ - الاحزاب: ۱ ۳ - القلم: ۸ ٤ - الشعراء: ۱۵۱

۵-اہلِ کتاب کی اطاعت نہ کی جائے۔

" اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقاً مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كَافِرِيْنَ". (۵)

٦- آثم (بدکار) اور کَفُور (ناشکرے) کی اطاعت نہ کی جائے۔

"وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُوْرًا". (٦)

۷-جس کا دل خدا کی یاد سے خالی ہو اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا". (٦)

۸- جو خواہشات نفس کا پیرو کار ہے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

"وَاتَّبَعَ هَوٰهُ". (۷)

۹-جس کا حکم بے اعتدالی پر مبنی ہے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

" وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا". (۵)

۱۰-نماز سے روکنے والے کی اطاعت نہ کی جائے۔

" كَلَّا لَا تُطِعْهُ". (٦)

۱۱- حَلَّاف (زیادہ قسمیں کھانے والا) اور مَھِین (پست، بے وقعت) کی اطاعت نہ کی جائے۔

" وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ". (۷)

۱۲- هَمّاز (طعن کرنے والا) مَشّآء (چغلی کے ساتھ گھومنے والا) اور نمیم (چغل خور) کی اطاعت نہ کی جائے۔

۱-آلِ عمران:۱۰۰ ۲- الدھر:٢٤ ۳-الکھف:۲۸ ٤- الکھف:۲۸
۵- الکھف:۲۸ ٦-العلق:۱۹ ۷- القلم:۱۰

"هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ". (1)

۱۳-مَنَّاع لِلْخیر (بھلائی سے روکنے والا) اور مُعتَد (حد سے گزرنے والا) اثیم (بدکار) کی اطاعت نہ کی جائے۔

"مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيمٍ". (2)

۱٤-عُتُلّ (جا کار) زَنیم (بداصل) کی اطاعت نہ کی جائے۔

"عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ". (3)

۱۵- والدین شرک اور حرام پر مجبور کریں تو ان معاملات میں والدین کی اطاعت بھی نہیں کی جائے گی۔

"وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَاتُطِعْهُمَا". (4)

دو بنیادی اصول:

اطاعت کے سلسلے میں دو بنیادی اُصول ہیں:

۱- پہلا اُصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ چاہے وہ ولی ہو، امام ہو، والد ہو، والدہ ہو، امیر ہو، بادشاہ ہو، شوہر یا کوئی اور ہستی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لَاطَاعَةَ فِیْ مَعْصِيَةٍ، اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ" (5)

"غیر اللہ کی اطاعت، صرف معروف (نیکی) میں ہوسکتی ہے، معصیت اور نافرمانی میں کسی کی کوئی اطاعت نہیں۔"

۱- القلم: ۱۱ ۲- القلم: ۱۲ ۳- القلم: ۱۳
٤- العنکبوت: ۸، لقمان: ۱۰
۵- بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب: ۱، حدیث ۷۲٤٤

۲- دوسرا اُصول یہ ہے کہ معروف یعنی اچھے کاموں میں غیر اللہ کی اطاعت ہوسکتی ہے لیکن یہ بھی بقدرِ استطاعت ہی ہوگی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیعت کے موقع پر اس شرط کا اضافہ کردیتے تھے کہ یہ اطاعت تمہاری مالی، جسمانی، ذہنی قوت وطاقت ہی کے مطابق مطلوب ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔

" كُنَّانُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه و سلم عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، يَقُوْلُ لَنَا: فِيْمَا اسْتَطَعْتَ". (۱)

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں فرماتے: جتنی تم میں استطاعت ہے (اُسی قدر سمع وطاعت مطلوب ہے)۔"

اولوالامر کی اطاعت:

اولوالامر کی اطاعت کا حکم، قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی ملتا ہے۔

" مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ". (۲)

"جس نے میری اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے درحقیقت اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے درحقیقت میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے درحقیقت میری نافرمانی کی۔"

اسلام میں حکمرانوں کے اچھے کاموں پر اطاعت سے بالشت بھر بغاوت بھی جاہلیت کا عمل قرار پاتی ہے۔ حدیث نبوی خبر دیتی ہے:

۱- مسلم، کتاب الامارة، باب ۲۲، حدیث ٤٩٤٣
۲- بخاری، کتاب الجهاد، باب ۱۰۹، حدیث ۲۹۹٤

"لَيْسَ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا فَمَاتَ عَلَيْهِ إِلَّا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً".[1]

"جو شخص بھی حکمران کی اطاعت سے بالشت بھر بغاوت اختیار کرتا ہے اور اسی کیفیت میں اُس کی موت واقع ہوتی ہے تو اُس کی موت جاہلیت کی موت قرار پائے گی۔"

ذاتی پسند اور ناپسند دونوں حالتوں میں اطاعت لازم ہے۔

"اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوْا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ".[2]

"سنو اور اطاعت کرو! کیونکہ ان (امرا) پر جو بوجھ ڈالا گیا وہ انہی کے ذمہ ہے اور جو تمہارے اوپر ڈالا گیا ہے وہ تمہارے ذمے ہے۔"

امیر کے ناگوار احکامات پر صبر کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ رَأَى مِنْ اَمِيْرِهِ شَيْئًا فَكَرِهَهُ فَلْيَصْبِرْ".[3]

"جو کوئی اپنے امیر (حکمران) کے احکامات میں کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو اُسے پسند نہیں ہے تو ایسی صورت میں اسے صبر سے کام لینا چاہیے۔"

امیر سے اجازت لینا ضروری ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"لَمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوْهُ".[4]

١- مسلم، کتاب الامارة، باب ١٣، حدیث ٤٨٩٧

٢- بخاری، کتاب الحکام، باب ٤، حدیث ٤٨٨٩

٣- بخاری، کتاب الاحکام، باب ٤، حدیث ٧٢٣٠ ٤- النور: ٦٢

امیر کے اوصاف:

قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف امیر کی اطاعت ضروری ہے بلکہ امیر کے انتخاب میں مسلمانوں کو عرق ریزی سے کام لینا چاہیے۔ امیر کے اوصاف پر مبنی چند آیات اور احادیث ملاحظہ فرمائیے:

امیر صاحبِ علم ہو اور تندرست ہو۔

"بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ". (۱)

امیر عام لوگوں سے زیادہ متقی ہو۔

"اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاكُمْ". (۲)

امیر کا شکل وصورت میں حسین ہونا ضروری نہیں۔

"اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ". (۳)

"سنو اور اطاعت کرو! اگرچہ کسی حبشی غلام کو جس کا سر کشمش کی طرح چپٹا ہو تمہارا امیر بنا دیا جائے۔"

امیر طالبِ اقتدار نہ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ! لَاتَسْأَلِ الْإِمَارَةَ، فَاِنَّكَ اِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ اُكِلْتَ اِلَيْهَا، وَاِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَيْهَا". (۴)

"اے عبدالرحمٰن! امارت طلب نہ کرو! اگر تمہیں مانگنے پر امارت دے دی گئی تو تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر بغیر مانگے عطا ہوئی تو پھر تمہاری (منجانب اللہ)

۱- البقرة: ۲٤۷ ۲- الحجرات: ۱۳

۳- بخاری، کتاب الاحکام، باب ٤، حدیث: ۷۲۲۹

٤- مسلم، کتاب الامارة، باب ۳، حدیث ٤۸۱۹

مدد کی جائے گی۔"

۵- خلاصۂ کلام:

اطاعت مطلق بھی ہے اور مشروط بھی۔

اطاعت ضروری ہے تاکہ معاشرہ منظّم ہو ورنہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

٦- ہمارے لیے پیغام:

سمع و طاعت یعنی Order & Discipline ہماری دینی ضرورت اور فریضہ ہے۔ ہمارا معاشرہ غیر منظّم اور منتشر ہے۔ اسے منظّم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ صالح افراد کی اطاعت کی جانی چاہیے۔ بدکاروں کی اطاعت سے بچنا چاہیے۔ بدکاروں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔

۷- دعائیہ کلمات:

" سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا، وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ". (۱)

۱- البقرۃ: ۲۸۵

درس کی مقبولیت کیسے؟

آپ کا کام الحمدللہ مکمل ہوا، لیکن اس میں بہتری کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ درج ذیل چند باتوں سے آپ کے درس میں نافعیت اور قبولیت زیادہ سے زیادہ پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ ان کو اپنا کر محنت کرتے رہیے اور یاد رکھیے کہ اس کائنات میں ثبات صرف تغیر کو ہے۔ یعنی جب کوئی چیز ترقی نہیں کر رہی ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنزل کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کی قابلیت اور قبولیت میں اضافہ نہیں ہو رہا تو وہ ایک دن معکوس سفر کرتے ہوئے صفر کی سطح پر پہنچ جائے گی۔ آئیے! دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے درس کی محفل کو کس طرح مقبول و نافع بنا سکتے ہیں:

۱- قرآن اور قرآنی علوم سے شغف پیدا کیجیے۔ اسے اپنا اوڑھنا بچھونا اور حرز جان بنائیے۔ حتیٰ کہ تفسیر پر مہارت کے ساتھ آپ کا اخلاق و کردار بھی قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں۔ جب قرآن آپ کے دل کا شوق اور روح کی تسکین بن جائے گا تو آپ کے لیے قرآن کریم سے ملنے والی ہدایات اور عملی زندگی میں قرآن کریم کے پیغام کو واضح کرنا آسان اور من پسند مشغلہ ہو جائے گا۔

۲- اردو زبان سے اپنا تعلق مضبوط کیجیے۔ شائستہ اور معیاری و مہذب زبان بولنے کی عادت ڈالیے۔ بڑے خطیبوں کو سنیے۔ بڑے ادیبوں کی تحریروں کو غور سے پڑھیے اور کام کے الفاظ و تراکیب کو نوٹ کر کے اپنی گفتگو میں استعمال کیجیے۔ قرآن کریم کے معیاری ترجمے اور آسان تشریحات کے لیے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے

ترجمے سے مدد لیجیے۔

۳- اپنی گفتگو کی درج ذیل تین چیزوں کے ساتھ مطابقت پیدا کیجیے:

۱-جسم کی حرکات وسکنات۔ ۲-چہرے کے تاثرات۔ ۳-آواز کا اتار چڑھاؤ۔

اس کتاب کے مقدمے کے علاوہ ایک مستقل عنوان کے تحت ان تینوں کی اہمیت وضرورت اور مطلب ومراد پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

٤- خارجی مطالعہ بڑھائیے۔ دنیا میں کیا کچھ ہورہا ہے؟ کون سی نئی ایجادات ونظریات سامنے آرہے ہیں؟ مسلمانوں پر فکری وسیاسی حملے کس عنوان سے ہورہے ہیں؟ مستشرقین اوران کے آلہ کار اسکالر کس طرح بھیس بدل بدل کر مسلمانوں کے بچے کھچے ایمان وعمل کی تخریب کی فکر میں ہیں؟ جب تک آپ کو یہ سب کچھ معلوم نہ ہوگا اس وقت تک آپ اپنے سامعین کی قرآنی تعلیمات کی روشنی میں راہنمائی نہیں کرسکتے اور جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے آپ نہ اللہ ورسول کا حق ادا کرسکیں گے نہ قرآن کا اور نہ اپنے ان مقتدیوں اور پیروکاروں کا جو آپ سے اپنی رہنمائی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا خدارا! نصابی اور درسی مطالعے پر اکتفا نہ کیجیے۔ کام کی خبروں، مشہور کالم نگاروں، معلوماتی کتابوں اور نئی تحقیقات کو پڑھیے اوران کا خلاصہ بطور یادداشت ایک کاپی میں نوٹ کرتے رہیے۔

۵- آخری بات یہ ہے کہ دردِ دل پیدا کیجیے۔ کسی سچے اللہ والے سے اصلاحی تعلق قائم کیجیے۔ اپنے باطن کے تزکیہ وتحلیہ کی فکر کیجیے اور پھر اپنے سامعین کی نظری وعملی اصلاح کی کڑھن اور تڑپ کے ساتھ کام کیجیے۔ دیکھیے کچھ عرصے میں ایمان کی کیسی بہار آتی ہے۔

درسِ قرآن کے لیے چند مجوّزہ موضوعات

عقیدہ:

☆توحید ذات

☆توحید صفات

☆تشریعی توحید یا توحید حاکمیت

☆رسالت اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

☆آخرت (برزخ، حشر، جنت، دوزخ)

☆آخرت اور ایمان کا تعلق

عبادات:

☆نماز ☆روزہ ☆حج ☆زکوٰۃ ☆جہاد ☆قربانی ☆تلاوت
☆ذکر ☆استغفار

معاشی مسائل:

قرآن کی معاشی تعلیمات، حلال ذرائع آمدنی، خرچ میں اعتدال، اسراف، بخل

معاشرت:

بیوی کے حقوق، بچوں کے حقوق، والدین کے حقوق، رشتے داروں کے حقوق، نکاح، طلاق، خلع، ہبہ، وصیت، وراثت

حدود اور سزائیں:

زنا، قصاص، قتل، قذف، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔

اخلاقیات:

غیبت، چغلی، حسد، بہتان، تمسخر، تجسس، حلم، تواضع، عفوو درگزر، احسان، کظمِ غیظ۔ (غصہ پر قابو پانا)

معاملات:

تجارت، شراکت، مضاربت، اقساط، سود، انشورنس، مارک اپ، قرض، رشوت، شیئرز۔

نظمِ اجتماعی:

امارت، شورائیت، نظم ونسق، جہاد، سمع وطاعت، داخلہ پالیسی، خارجہ پالیسی، ذمیوں کے حقوق، آزادیٔ اظہارِ رائے، بنیادی حقوق، سفارش، اقربا پروری، ملوکیت۔

جامع مضامین:

قرآن مجید کے بعض مقامات پر ایک ہی پیراگراف میں کئی مضامین آئے ہیں۔ آپ کی سہولت کے لیے ہم یہاں پانچ مقامات کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ آپ درسِ قرآن کے لیے ان حصوں کو بھی منتخب کر سکتے ہیں۔

۱- سورۃ بنی اسرائیل	(آیات: ۲۳ تا ۳۹)
۲- سورۃ الفرقان	(آیات: ٦٣ تا ۷۱)
۳- سورۃ المؤمنون	(آیات: ۱ تا ۱۱)
٤- سورۃ لقمان	(آیات: ۱۳ تا ۱۹)
۵- سورۃ الانعام	(آیات ۱۵۱ تا ۱۵۵)

مختلف موضوعات پر درسِ قرآن کی تیاری کے لیے آیات کے حوالہ جات

نمبر شمار	مضمون	حوالہ جات	سورۃ اور آیات نمبر
١	ثنائے رب	سورۃ الفاتحہ	الفاتحہ ١-٧
٢	صفاتِ الٰہی	سبح اللّٰہ ما..............تعملون خبیر	الحدید ١-١٠
٣	صفاتِ الٰہی	یسبح اللّٰہ ما.............. وبئس المصیر	التغابن ١-١٠
٤	ایمان کی دولت	للّٰہ مافی............ علی القوم الکفرین	البقرۃ ٢٨٤-٢٨٦
٥	توحید اور اس کے تقاضے	وھو الذی............... حکیمٌ علیمٌ	الانعام ٧٣-٨٣

٦	صفاتِ الٰہی	قل اللّٰھم............... رؤفٌ بالعباد	آل عمران ٢٦-٣٠
٧	اسمائے حسنٰی	یایھاالّذِین امنوا.............العزیز الحکیم	الحشر ١٨-٢٤
٨	امانت	یایھاالّذِین امنوا.............غفورًا رحیمًا	الاحزاب ٦٩-٧٣
٩	آلاءاللہ (اللہ کی نعمتیں)	اللّٰہ نور..............الیٰ صراطٍ مّستقیم	النور ٣٥-٤٦
١٠	(اللہ کی نعمتیں)	الرّحمٰن............. ربّکما تکذّبٰن	الرحمن ١-٣٠
١١	اللہ کی نشانیاں	فسبحٰن اللّٰہ............. العزیز الحکیم	الروم ١٧-٢٧
١٢	کائنات میں غوروفکر	ان فی خلق............. لعلکم تفلحون	آل عمران ١٩٠-٢٠٠
١٣	ربوبیت کے تقاضے	والسماء............. الّذی یوعدون	الذریٰت ٤٧-٦٠
١٤	حقیقت شرک	افمن وعدنه............. کانوا یفترون	القصص ٦١-٧٥

١٥	رسالت	یایھاالمزمّل.............. الیٰ ربّہٖ سبیلاً	المزمل ١-١٩
١٦	رسالت اور جہاد	سبح للّٰہ........... ولو کرہ المشرکون	الصف ١-٩
١٧	منافقین اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم	الم ترالی............. و کفیٰ باللّٰہ علیما	النساء ٦٠-٧٠
١٨	احترامِ رسالت	یایّھاالّذین............ لعلکم ترحمون	الحجرات ١-١٠
١٩	قرآن کی عظمت	فلااقسم بمواقع....... باسم ربك العظیم	الواقعة ٧٥-٥٠
٢٠	اسوۂ ابراہیم علیہ السلام	وَاذکر فی الکتٰب..... لسان صدق علیّا	مریم ٤١-٥٠
٢١	توحید کے تقاضے	یایھاالنّاس..... ونعم النّصیر	الحج ٧٣-٧٨
٢٢	اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم	لقد کان لکم..... غفورًا رّحیماً	الاحزاب ٢١-٢٤
٢٣	آخرت	ویوم القیٰمة..... بما یفعلون	الزمر ٦٠-٧٠

٢٤	مناظرِ قیامت	فمن یّعمل............. علی ماتصفون	الانبیاء ٩٤- ١١٢
٢٥	مناظرِ قیامت	و نفخ فی الصّور.........من یّخاف وعید	ق ٢٠- ٤٥
٢٦	مناظرِ قیامت	فاِذانفخ فی الصّور........ الّاالخَاطئون	الحاقة ١٣- ٣٧
٢٧	مناظرِ قیامت	فاذا برق البصر........ ان یّحی الموتیٰ	القیٰمة ٧- ٤٠
٢٨	نشانِ عبرت	اذن للّذین........ والیّ المصیر	الحج ٣٩-٤٨
٢٩	دنیاوی عذاب کی مثالیں	قُلْ اَئنّکم......... و کانو یتّقون	حم السجدة ٩-١٨
٣٠	کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار	افحسب الّذینَ........ بعبادة ربّہ احدًا	الکھف ١٠٢- ١١٠
٣١	حقیقی کامیابی	قُل ربّ اِما......... انت خیر الرّٰحمین	المومنون ٩٣-١١٨
٢٣	کاروبارِ نجات	یایھاالّذین امنو........ فاصبحو ظٰھرین	الصف ١٠-١٤

۳۳	مومن کی مثالی زندگی	تبٰرکَ الّذی جعل........ یکون لزاماً	الفرقان ۶۱-۷۷
۳۴	مجرم اور مومن کا فرق	کلا انّھا لَظٰی........فی جنّٰتٍ مّکرمون	المعارج ۱۵-۳۵
۳۵	صفات مؤمنین	قد افلح المؤمنون........ تحملون	المؤمنون ۱-۲۲
۳۶	صدقہ وانفاق	اعْلَمُو انّما........ قویٌّ عزیزٌ	الحدید ۲۰-۲۵
۳۷	انفاق کی اہمیت وفضیلت	مثل الّذین........ فانّ اللّٰہ بہ علیمٌ	البقرة ۲۶۱-۲۷۳
۳۸	اِنفاق	الّذین ینفقون........ وھم لایظلمون	البقرہ ۲۷۴-۲۸۱
۳۹	روزہ	یاایّھاالّذین........ وانتم تعلمون	البقرة ۱۸۳-۱۸۸
۴۰	حج	الحجّ اشھر........ الیہ تحشرون	البقرة ۱۹۷-۲۰۳
۴۱	استغفار	قل یعبادی........ و کنت من الکفرین	الزمر ۵۳-۵۹

٤٢	دعوت وتبلیغ	وَقال الّذین........ هو السمیع العلیم	حم السجدة ٢٦-٣٦
٤٣	رسولوں کی دعوت	واضرب لهم........ لدینا محضرون	یٰس ١٣-٣٢
٤٤	اقامتِ دین واعلائے کلمۃ اللہ	شرع لکم........ لعلّ السّاعة قریب	الشوریٰ ١٣-١٧
٤٥	اللہ کی محبوب قوم	یاایّھاالّذین........ قوم لّا یعقلونَ	المائده ٥٤-٥٨
٤٦	حق وباطل کی کشمکش	یاایّھاالّذین........ یفقھون حدیثاً	النساء ٧١-٧٨
٤٧	صبرو استقامت	یاایّھاالّذین........ ھوالرّحمٰن الرّحیم	البقرة ١٥٣-١٦٣
٤٨	مومنین کی ثابت قدمی	ولقد اتینا........ بغافل عمّا تعملون	ھود ١١٠-١٢٣
٤٩	مومنین کی آزمائش	الم، اَحسب النّاس..... عما کانوا یفترون	العنکبوت ١-١٣
٥٠	ایثاروقربانی	ان اللّٰه اشتریٰ........ ھوالتّواب الرّحیم	التوبة ١١١-١١٨

٥١	منافق،کافر اورمؤمنین	ام حسب الّذین........ لایکونوا امثالکم	محمد ٢٩-٣٨
٥٢	نظمِ اجتماعی	یاایّھاالّذین........ واکثرھم الفٰسقون	آل عمران ١٠٢-١١٠
٥٣	مومن کے حقوق وفرائض	یاایّھاالّذین امنوا........ بما تعملون	الحجرات ١١-١٨
٥٤	خواتین معاشرہ کااہم حصہ	یاایّھاالّذین امنوا...... وکانت من القٰنتین	التحریم ٨-١٢
٥٥	خواتین کا کردار	یاایّھاالنّبیُّ........ ضلَّ ضلٰلاًمّبیناً	الاحزاب ٢٨-٣٦
٥٦	بےکرداراہلِ نفاق	اذا جاءكَ المنافقون.....خبیر بما تعملون	المنافقون ١-١١
٥٧	منافقین	ان المنٰفقینَ........ غفورًا رّحیمًا	النساء ١٤٢-١٥٢
٥٨	دوزخ میں منافقین کے احوال	من ذا الذی........ اصحٰب الجحیم	الحدید ١١-٢٩

۵۹	حُبِ دنیا	ان قارونَ........ ما کانوا یعملون	القصص ٧٦-٨٤
٦٠	جنت کی لازوال زندگی	ولمن خاف مقام...ذی الجلال و الاکرام	الرحمن ٤٦-٧٨
٦١	جنت	ھل اتیٰ علی........ سعیکم مشکورًا	الدھر ١-٢٢
٦٢	جنت	الرٰ، تلك ایٰت........ ربّ الغلمین	یونس ١-١٠
٦٣	خسارے سے بچنے کا قرآنی نسخہ	سورۃ الْعَصْر	اَلْعَصْر ١-٣

درسِ حدیث

حدیث قرآن کریم کی ترجمان ہے۔ کتاب اللہ کے بعد ہمارے لیے یہی مرجع ومنبع ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مواعظ و ارشادات کے ذریعے سے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ فرمایا، علمائے کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس اور بابرکت کلمات کے ذریعے آج بھی اپنے اور امت کے نفوس کے تزکیے اور مقاصد بعثت کی تکمیل میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

درسِ قرآن کی طرح درسِ حدیث کا بھی معمول بنائیے۔ اس بارے میں آپ خود اپنے ماحول اور علاقے کے مطابق طے کرسکتے ہیں کہ ہفتے میں کتنے دن درسِ قرآن ہونا چاہیے اور کتنے دن درسِ حدیث؟ کس نماز کے بعد درسِ قرآن مناسب ہے اور کون سی نماز کے بعد لوگ حدیث سننے سے ایمان کی تازگی محسوس کریں گے؟ یومیہ کتنے منٹ تذکیر بالقرآن کے لیے ہونے چاہییں اور کتنے تذکیر بالحدیث کے لیے؟ اس کی تعیین کا استخارے اور استشارے کے ذریعے آپ کو اختیار ہے۔

درسِ حدیث کے بھی دو طریقے ہیں: کسی مخصوص حدیث کا درس یا پھر موضوعاتی درس۔ دونوں کی تیاری کا طریقہ بھی اول سے آخر تک تقریباً وہی ہے جو درسِ قرآن کی تیاری میں گذرا۔ اسے پھر دیکھ لیجیے۔ یہاں ہم خلاصہ نقل کردیتے ہیں لیکن اس سے پہلے درس حدیث کے اُصولوں پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

درسِ حدیث کے اُصول

۱- مقصد کا تعین کر لیجیے:

درسِ حدیث کی تیاری کے سلسلے میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ درس کا مقصد متعین اور واضح ہونا چاہیے، مثلاً:

۱- اللہ کے بندوں کو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جوڑنا ہے۔ اللہ کا بندہ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا امتی بنانا ہے۔

۲- قرآن کریم، انبیائے کرام اور بالخصوص خاتم النبیین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام مسلمانوں تک پہنچانا، سمجھانا اور ان کے لیے اتباع نبوی کی راہ آسان کرنا ہے۔

۳- جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمانی تعلق کو تازہ کرنا، آپ کی عظمت ومحبت کو دل میں پیدا کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرنا اور کروانا ہے۔

٤- لوگوں کو نیک کاموں کی طرف راغب کرنا اور گناہوں سے توبہ کروانا ہے۔

۵- معاشرے میں معروف کی ترویج اور منکر کا ازالہ کرنا ہے۔

۲- تیاری کے بغیر درس نہ دیجیے:

☆ بھرپور تیاری کیجیے۔ جب تک کافی عرصہ نہ گذرے اور بھرپور تجربہ نہ ہو جائے اس وقت تک بغیر تیاری کے درس نہ دیجیے۔

☆ آپ کی محنت اتنی اچھی ہو کہ لوگ ایمان، تازگی اور روحانی فرحت محسوس کریں

اور یہ احساس لے کر اٹھیں کہ اس درس سے ہم میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور ہمیں اپنی زندگیاں تبدیل کرنی چاہییں۔

۳- موضوع سے وابستہ رہیے:

ہمیشہ مقصدیت کو پیش نظر رکھیے۔ غیر ضروری تفصیلات سے بچیے۔ کوشش کیجیے کہ "جملۂ مُعترضہ" طویل نہ ہونے پائے اور آپ اصل موضوع سے دور نہ نکلیں۔ اس کمزوری سے آپ صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جب آپ کی نگاہ مقصد پر مرکوز ہو اور آپ موضوع سے وابستہ رہیں۔ اگر کسی مناسبت سے دور جانا پڑے تو ضمنی بات پوری ہوتے ہی فوراً واپس لوٹ آئیں۔ "ضمنی در ضمنی" گفتگو سے سخت پرہیز کریں۔

٤- مُستند واقعات بیان کیجیے:

جھوٹے واقعات، گھڑی ہوئی حدیثیں اور عام زبان زد غیر مستند مذہبی داستانیں اور بلاسند باتوں سے پرہیز کیجیے۔ یہ علمیت کی شان سے کمتر اور تاثیر سے عاری ہوتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبردار کیا ہے:

"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کر ڈالے"۔

۵- لفّاظی سے اجتناب کیجیے:

تکلف پر مبنی لفاظی سے گریز کیجیے۔ اس سے عملاً خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ اصل چیز دل کے درد پر مبنی دعوت ہے۔ الفاظ سے زیادہ معانی پر آپ کی نگاہ ہو۔ اس سے سامعین کو حقیقی فائدہ ہوتا ہے۔

٦- گفتگو کو نکات میں تقسیم کر لیجیے:

آپ کی گفتگو عقلی منطقی انداز سے مرتب اور آپ کا اسلوب سائنٹیفک (Scientific)

ہونا چاہیے، یعنی اپنی بات کو نِکات (Points) میں تقسیم کرلیجیے اور ترتیب وار بیان کیجیے۔ منطقی ربط سے کہی گئی بات لڑی میں ترتیب سے پروئے گئے خوبصورت موتیوں کی طرح ہے جو انسان کو فطری طور پر متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

۷- تکلف سے بچیے:

دورانِ درس کوئی شعر، لطیفہ، واقعہ یا حکایت بلا تکلف یاد آ جائے تو سنا دیجیے لیکن اسے بزورِ زیرِ بحث نکتے پر منطبق کرنے کی کوشش ہرگز نہ کیجیے۔

۸- استغنا اور وقار سے رہیے:

اپنی ذات کے لیے کچھ نہ مانگیے۔ مدرس جب دستِ سوال دراز کرتا ہے تو اس کی دعوت کی ساری تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی دعوتی کاوشوں کو للہ فی اللہ خدمت تک محصور رکھیے۔ اپنے دینی ادارے کے لیے بھی تعاون کی ترغیب اس انداز میں نہ دیجیے کہ حاضرین اسے وقار سے کم تر یا شانِ علم کے منافی سمجھیں۔

۹- اہم بات کو تین مرتبہ دہرائیے:

اہم بات کو تین مرتبہ دُہرانا سنّت نبوی ہے۔ درس کے آغاز میں گفتگو کے مرکزی نکات اور ماحصل بیان کیجیے۔ پھر اس کی مربوط تشریح کیجیے اور آخر میں خلاصۂ مضمون کا اعادہ کیجیے۔ اس طرح بات تین مرتبہ سامعین تک پہنچ جائے گی اور اللہ نے چاہا تو سامعین کے ذہن پر نقش ہو جائے گی۔

۱۰- ہر ہفتہ ایک نیا موضوع منتخب کیجیے:

احادیث کا ذخیرہ ایسا بابرکت ہے کہ ہر موضوع پر بے شمار احادیث مل سکتی ہیں۔ عقائد، اخلاق، فضائل، مسائل۔ سماجیات، عمرانیات، معاشیات، اصلاحیات۔ لہٰذا حاضرین اور عام معاشرے کی ضرورت کے مطابق درس میں تنوع پیدا کیجیے۔

۱۱- اپنے ظاہر و باطن کو درست کیجیے:

مدرس کا لباس پروقار اور طرز عمل شائستہ ہو۔ عمامہ اور جبہ وغیرہ ایسی مبارک سنتیں ہیں جن سے عالم دین خوش منظر اور پروقار نظر آتا ہے اور اس سے اس کی بات کو مقبولیت ملتی ہے۔

دورانِ درس، پان، چھالیہ وغیرہ کا استعمال کیجیے اور نہ ہی دورانِ درس کان، ناک یا بدن کھجائیے۔ اس طرح کی غیر شائستہ حرکات سے گریز کیجیے۔

کسی سچے اللہ والے سے اصلاحی تعلق قائم کر کے اپنے باطن کی اصلاح کیجیے اور پھر لوگوں کو نفس اور شیطان کے چنگل سے چھڑانے اور ان کے ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کیجیے۔

۱۳- حدیث شریف کو زندہ جاوید شکل میں پیش کیجیے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ارشادات قیامت تک بنی نوع انسان کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اپنے طرز تدریس سے اس کلیے کو زندہ حقیقت ثابت کر کے دکھائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حدیث شریف کا ترجمہ و تشریح کے بعد اس کے فوائد و نکات بیان کرتے ہوئے حدیث شریف کے امر و نہی، وعد وعید، ترغیب و ترہیب کا اپنے گرد و پیش پر انطباق کیجیے! آپ کا درس محض ماضی کی حکایت نہ ہو، یہ حدیث شریف سے ناانصافی ہے۔ حاضرین کو حدیث شریف سے حالات حاضرہ میں رہنمائی اور عبرت و موعظت حاصل ہونی چاہیے اور انہیں محسوس ہونا چاہیے کہ حدیث پاک آج بھی انگلی پکڑ کر ان کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس کے بغیر درس میں جان بھی پیدا نہ ہوگی اور سامعین کی عملی زندگی میں بہتری کی امید بھی کم ہو جائے گی۔

درسِ حدیث کے لیے وقت کی تقسیم

درج ذیل جدول پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ درسِ حدیث کے دورانیے کو کس طرح مختلف امور کے لیے تقسیم کیا گیا ہے؟ اور ہر حصے کے لیے کتنا وقت تجویز کیا گیا ہے؟

نمبرشمار	عنوان	وقت	تفاصیل
۱	خطبہ اور حدیث شریف	۳ منٹ	موضوع سے متعلق جامع احادیث کی بلند آواز اور بارعب انداز سے خواندگی
۲	ترجمہ	۳ منٹ	کلامِ نبوی کے شایانِ شان۔ رواں، اَدَبی اور معیاری
۳	خلاصۂ موضوع	۱ منٹ	نہایت اختصار سے
٤	اصل موضوع پر گفتگو	۲۰ منٹ	بھرپور اور جامع انداز سے
۵	خلاصۂ کلام	۱ منٹ	حاصلِ گفتگو کا اعادہ
٦	حاضرین کیلئے پیغام	۳ منٹ	سبق، عبرت اور دورِ حاضر پر تطبیق
۷	دعائیہ کلمات	۱ منٹ	دعوت میں تاثیر اور زندگیوں میں تبدیلی کے لیے اللہ سے اِستعانت
۸	سوال و جواب	۵ منٹ	پہلے موضوع سے متعلق
	سوال و جواب	۳ منٹ	پھر عمومی نوعیت کے
	کل وقت	٤٠ منٹ	

عام طور پر ہفتہ واری درسِ حدیث کا دورانیہ (بشمول سوال و جواب) اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یومیہ درسِ حدیث کا دورانیہ پانچ سے دس منٹ بہت ہے۔

درسِ حدیث کی دو قسمیں اور ان کا طریقہ

درسِ قرآن کی طرح حدیث شریف کا درس بھی دو طرح کا ہے:

(۱) کسی مخصوص حدیث کا درس، چاہے اس میں ایک سے زیادہ موضوع ہوں۔

(۲) کسی ایک موضوع سے متعلق حدیث یا احادیث کا درس، چاہے اس کے لیے حدیث کے کچھ حصے چھوڑنا پڑیں۔

مخصوص حدیث کا درس:

مخصوص حدیث کے درس کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھیے:

۱-حسنِ صَوت:

مُدَرِّس، درس کا آغاز خطبہ اور حدیث شریف کی بلند خواندگی سے کرے۔

مُدَرِّسِ قرآن کو چاہیے کہ وہ کسی ماہرِ فن قاری سے تجوید درست کرے اور ترتیل، تجوید اور ممکنہ حد تک حُسنِ صوت (اگر ممکن ہو تو ترنّم) کے ساتھ خطبہ اور حدیث شریف پڑھا کرے۔

۲-ترجمہ:

حدیث کا ترجمہ کلامِ نبوی کے شایانِ شان ہو۔ زوردار ہو اور مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے والا ہو۔ ترجمے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیے:

۱- ترجمہ معیاری ہو، لفظی نہ ہو۔

۲- ترجمہ اَدَبی اور شائستہ زبان میں ہو۔ اچھی زبان مہذب اور شائستہ ہونے کی

علامت ہے۔ اردو پر اپنی گرفت مضبوط کیجیے اور رائج الوقت محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال استعمال کر کے گفتگو میں کشش اور شیرینی پیدا کیجیے۔

متروک الفاظ استعمال نہ کیجیے نہ بھاری بھرکم تراکیب سے اپنی علمیت کا رعب جھاڑیے۔ مثلاً: نکبت وادبار، مال ومنال، نالہ وشیون، خرق عادت وغیرہ وغیرہ۔

بامحاورہ، عام فہم اور رواں ترجمہ کیجیے تا کہ سامعین تک مقصد کی بات پہنچ جائے۔

۳- ترجمہ بآوازِ بلند پڑھا جائے تا کہ سامعین پر کلامِ نبوی کی ہیبت اور اس کا دبدبہ طاری ہو جائے۔

۳- پسِ منظر:

پسِ منظر، اور واقعاتی حقائق پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔ یہ چیزیں مطالعے سے تعلق رکھتی ہیں۔ درس کا مختصر وقت اس قسم کی تفصیلات کا مُتَحَمِّل نہیں ہوسکتا۔ پسِ منظر کا ذکر صرف اتنا کیا جائے جتنا بات سمجھانے کے لیے ضروری اور ناگزیر ہو۔ اگر کلامِ نبوی کو ایک زندہ جاوید رہنما کی حیثیت سے پیش کرنا ہے تو مقصدیت پر زور دیجیے۔ عوام کے لیے یہی کافی ہے۔ بقیہ تفصیلات خواص کے لیے ہوتی ہیں۔

٤- مرکزی مضمون:

مرکزی مضمون یا عمود (Theme) دراصل وہ بنیادی موضوع ہے جس کے اردگرد ساری حدیث گھومتی ہے۔ اگر آپ کسی طویل حدیث کے ایک مخصوص پیراگراف یا مخصوص حدیث کا درس دینا چاہتے ہیں تو آپ اس پیراگراف اور اس حدیث کے مرکزی مضمون کا تعین کیجیے اور اپنی گفتگو کو اس پر مرکوز اور اردگرد تک محدود رکھتے ہوئے سامعین تک فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی سعادت حاصل کیجیے۔

٥- مشکل الفاظ کی تشریح:

مشکل الفاظ کی تشریح عام فہم اور دلچسپ انداز میں کیجیے تا کہ سامعین میں فہم حدیث کا ذوق پیدا ہو۔

٦- فوائد و نکات:

اب آپ ایک ایک جملے کی سلسلہ وار تشریح کرتے جایئے اور اس کے لیے درج ذیل عناصر سے مدد لیجیے۔

١- آیات: حدیث کی وضاحت کے لیے قرآن کی آیات پیش کیجیے جو اس موضوع اور مضمون سے "براہِ راست" متعلق ہوں۔

٢- احادیث: آیات کی وضاحت کے لیے موضوع سے "براہِ راست" متعلق صحیح اور حسن احادیث پیش کیجیے۔ ضعیف اور موضوع (جھوٹی) احادیث سے گریز کیجیے۔

٣- سچے واقعات: موضوع سے متعلق سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کوئی "سچا واقعہ" پیش کیجیے۔ قرآن کتابِ حق ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں۔ قرآن و سنت اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصنوعی رنگ کے محتاج نہیں۔ واقعات میں نمک مرچ لگانے کی کوشش نہ کیجیے۔ مبالغہ آرائی سے بچیے۔

٤- سیرت اسلاف: بزرگان دین کی سچی حکایات، ان کا ذوق عبادت، شوقِ جہاد، فکرِ آخرت اور ان جیسے موضوعات پر آپ کے پاس مستند مواد موجود ہونا چاہیے جسے آپ وقتاً فوقتاً اپنے دروس میں استعمال کر سکتے ہیں۔

٧- وقت کی پابندی:

وقتِ مقررہ میں پیراگراف یا حدیث کے آخری جملے تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اس

کے لیے یہ تین باتیں آپ کی مدد کریں گی:

۱- کسی نکتے کو اتنا نہ کھینچیے کہ بعد میں آپ کو وقت کی کمی کا احساس ہو۔ گفتگو کی طوالت اور وقت کی پابندی نہ کرنا بیزاری کو جنم دیتا ہے۔

۲- بعض اوقات مدرّس بہت دور نکل جاتا ہے۔ موضوع کے آس پاس ہی رہیے۔ کسی نکتے کی وضاحت کے لیے اگر دور جانا پڑے تو فوراً لوٹ کر اصل مضمون کی طرف آجایئے۔

۳- کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تمام تفصیلات کا عوام الناس کے سامنے رکھنا مناسب نہیں۔ یاد رہے آپ کے سامنے صرف دعوتی پہلو نمایاں رہے جس کے نتیجے میں لوگوں کی فکر ونظر اور عملی زندگی میں انقلاب برپا ہو جائے۔

۸- خلاصۂ کلام:

ایک منٹ کے اندر پورے مضمون کا خلاصہ یعنی حاصلِ مضمون لوگوں کے سامنے رکھیے۔ دراصل یہ مرکزی مضمون/عمود (Theme) کا اِعادہ ہوگا۔

۹- ہمارے لیے پیغام:

خلاصے کے بعد لوگوں کو یہ بتایئے کہ اس مضمون میں میرے اور آپ کے لیے کیا پیغام ہے؟ اور ان ہدایات کی روشنی میں ہم اپنے باطن اور اپنے ظاہر کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں؟ معاشرے میں کون سی تبدیلیاں ناگزیر ہیں؟ نبوی ہدایات کی روشنی میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم اپنی زندگیوں کو نبی علیہ السلام کی مبارک تعلیمات اور منوّر سنتوں سے آراستہ کر کے اسوۂ حسنہ کو کتنی آسانی سے اپنا شعار بنا سکتے ہیں؟

۱۰- دعائیہ کلمات:

آخر میں ایسے دعائیہ کلمات کہیے جن سے دعا بھی ہو اور اصلاح بھی۔ لوگ جب

ایسی دعاؤں پر زیرِلب آمین کہیں گے تو یہ چیزیں آہستہ آہستہ ان کے عمل میں آنا شروع ہوجائیں گی۔

۱۱- سوال و جواب کے لیے تیار رہیے:

درس کے بعد سامعین کو سوالات کا موقع دیجیے۔ پہلے موضوع کے مختلف سوالات کا پھر عمومی سوالات کا اور آخر میں نجی سوالات کا۔ اس کے لیے درج ذیل ہدایات پیش نظر رکھیے:

۱- درس کی تیاری کے دوران یہ بھی سوچیے کہ سامعین کیا سوال کر سکتے ہیں؟ ممکنہ سوالات کو ذہن میں رکھ کر جوابات کے لیے تیار رہیے۔ اگر کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیجیے: "لَا اَدْرِی" (میں نہیں جانتا) دیکھ کر یا پوچھ کر بتاؤں گا۔ غلط جواب دینے سے خاموشی بہتر ہے۔

۲- زبانی سوالات کا موقع دینے سے عموماً محفل درس کا تقدس متاثر ہوجاتا ہے۔ حاضرین میں پرچیاں اور بال پین تقسیم کرنے کا نظم بنائیے اور موصول ہونے والے سوالات کو پڑھ کر فیصلہ کیجیے کہ کس کا جواب برسرِمحفل دینا ہے اور کس سائل کو درس کے اختتام پر بالمشافہ ملاقات کا کہنا ہے۔

۳- سوال وجواب کی نشست میں کبھی بجا اور کبھی بے جا تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا سامنا حوصلے، صبر اور خندہ پیشانی سے کیجیے۔ اس پر آپ کو مستقل اجر ملے گا اور لوگوں کے رجوع میں بھی اضافہ ہوگا۔

موضوعاتی درس حدیث کی تیاری

موضوعاتی درسِ حدیث کی تیاری، کسی مخصوص حدیث کے درس کی تیاری سے نہ صرف مختلف ہوگی بلکہ نسبتاً ذرا سی مشکل بھی۔ موضوعاتی درس کے لیے آپ کو مختلف مراحل میں محنت کرنی پڑے گی جن کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے۔

پہلا مرحلہ۔موضوع کا انتخاب:

موضوع کا انتخاب پہلا مرحلہ ہے۔ موضوع کے انتخاب میں وقت، حالات، جگہ اور سامعین کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔

۱ - موضوع زندہ ہو، مردہ نہ ہو:

درسِ حدیث کا موضوع زندہ ہو، مردہ نہ ہو۔ مثلاً: "مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی یلغار اور اس کا تدارک" ایک زندہ موضوع ہے لیکن "معتزلہ کون تھے؟" سے ہمارے دور کے عوام کی دلچسپی کیا ہوسکتی ہے؟ یا "گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے خارج ہوتا ہے یا نہیں؟" اس بحث کو عوام کے سامنے چھیڑنے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

۲ - موضوع عملی ہو، صرف نظری نہ ہو:

موضوع عَملی ہو، صرف نظری نہ ہو، مثلاً: "ایثار و اکرام" کا موضوع اتنا اہم ہے کہ اس کے ذریعے سے ہم اپنے معاشرے میں موجود بے شمار خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ بہترین ماحول تشکیل دے سکتے ہیں۔ جب کہ ایسے موضوعات جو صرف

نظری ہوں اور جن کی عملی افادیت نہ ہو ان سے سامعین کی بیزاری کا اندیشہ ہی لگا رہتا ہے۔

۳- موضوع تعمیری اور اصلاحی ہو، تخریبی نہ ہو:

درسِ قرآن کا موضوع تعمیری اور اصلاحی ہو، تخریبی نہ ہو۔ جیسے: "توکل وقناعت" کا موضوع ایک تعمیری موضوع ہے جبکہ علمائے حق کے درمیان اختلافی مسائل عام محفل کے لیے مناسب نہیں۔ جو شخص اس بارے میں جاننا چاہتا ہو اُسے کتابیں فراہم کی جاسکتی ہیں یا پھر متعلقہ آیات واحادیث کے حوالے دیے جاسکتے ہیں تاکہ وہ اس پر غور کر سکے۔

دوسرا مرحلہ - منتخب موضوع کے لیے احادیث کی تلاش:

۱- موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد آپ "موسوعۃ الاحادیث" والی سی ڈیز میں مطلوبہ احادیث تلاش کیجیے۔

۲- اس کے بعد "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث" سے موضوع سے متعلق الفاظ پر مشتمل احادیث لے کر الگ الگ کاغذ یا کارڈز پر لکھتے جائیے۔

۳- "معارف الحدیث" اور "ترجمان السنۃ" کی فہرست دیکھیے کہ کیا اس میں آپ کے انتخاب کردہ موضوع سے متعلق عنوان ہے یا نہیں؟ ہو تو متعلقہ احادیث نوٹ کر لیجیے؟

تیسرا مرحلہ - فوائد ونکات اور لطائف وحکایات کا انتخاب:

۱- آپ کے پاس الگ الگ کاغذ پر یا کارڈز (Cards) پر ایک ایک حدیث لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ترجمے پر اچھی طرح غور کیجیے۔ نکات ولطائف کو سمجھیے۔ "جوامع الکلم" جن فوائد ومعارف پر مبنی ہوتے ہیں ان سے آگاہ ہونا درس میں جان پیدا کر دے گا۔

۲- اسی موضوع سے متعلق سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم سے کوئی سچا اور مستند واقعہ تلاش کیجیے۔ "فضائل صحابہ" دیکھیے۔ "دارُالمصنفین" نے "سیرۃُ

الصحابة رضی اللہ عنھم" کے نام سے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کا آپ کے پاس ہونا بہت مفید ہے۔ اسلاف اور بزرگان دین سے منسوب صحیح المعنی حکایات کا انتخاب کیجیے۔

چوتھا مرحلہ - ترتیب (Proper Sequencing):

موضوع کا انتخاب ہو گیا، متعلقہ آیات تلاش کر لی گئیں۔ صحیح احادیث اکٹھی کر لی گئیں۔ اب آپ کے پاس کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کے لیے اگلا مرحلہ "مناسب ترتیب" یعنی Proper Sequencing کا ہے۔

کون سا کارڈ پہلے ہو؟ کون سا بعد میں؟ ان میں منطقی ربط کیسے پیدا کیا جائے؟

تمام کارڈز کو اپنے سامنے پھیلا دیجیے۔ ذیلی عنوانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کارڈز (Cards) کو مختلف گروپس میں تقسیم کر لیجیے اور ہر کارڈ پر ترتیب وار نمبر ڈالنا شروع کر دیجیے۔ فرض کیجیے آپ کا موضوع "توکل وقناعت" ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ:

☆ کچھ احادیث میں توکل وقناعت کا معنی بیان کیا گیا ہے۔

☆ کچھ میں ان کے فضائل بتائے گئے ہیں۔

☆ کچھ میں اسباب کو اختیار کرتے ہوئے توکل کا حکم دیا گیا ہے۔

☆ علاوہ ازیں آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ توکل کے مختلف درجات ہیں۔

اس مقام پر آپ کو احساس ہوگا کہ درس کا "ابتدائی ڈھانچہ" بن چکا ہے۔

پانچواں مرحلہ - ایڈیٹنگ (Editing):

اب ایک اور مرحلہ درپیش ہے اور وہ ہے ایڈیٹنگ (Editing) کا۔

لیکن اس سے پہلے آپ کو چند چیزوں کا جائزہ لینا ہے:

☆ یہ درس کس لیے ہے؟

☆ سامعین کون ہیں؟

☆ یہ درس کہاں ہوگا؟

☆ درس کا دورانیہ کیا ہوگا؟

☆ مطلوب کیا ہے؟

☆ الفاظ اور تراکیب کے لیے متبادلات پر غور کیجیے۔

☆ تکرار کو حذف کر دیجیے۔

☆ اہم چیز کو مناسب مقام اور جگہ فراہم کیجیے۔

☆ غیر اہم کا وقت کم کیجیے۔ ان کی تفاصیل کو حذف کر دیجیے۔

☆ ہر نکتے کے لیے ماقبل اور مابعد سے ربط تلاش کیجیے۔

یہاں تک پہنچ کر آپ نے پچانوے فیصد کام مکمل کرلیا ہے۔

آخری مرحلہ ۔موضوعاتی درس کا حتمی خاکہ:

آپ نے ایڈیٹنگ (Editing) یعنی حذف واضافے اور ترتیب کا کام مکمل کرلیا ہے۔ الحمدللہ، اللہ کا شکر ادا کیجیے۔

اب خدا کا نام لے کر حتمی خاکے (Final outline) کو لکھ لیجیے۔

حتمی خاکہ:

۱ - خطبہ:

خطبہ اور آیات واحادیث کی بلند آواز اور باوقار انداز سے خواندگی کیجیے۔

۲- ترجمہ:

حسبِ ہدایاتِ سابقہ ترجمہ معیاری اور بامحاورہ ہونا چاہیے۔

۳- خلاصۂ موضوع:

آج ہم جائزہ لیں گے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں "توکل وقناعت" کیا ہے؟ اس کی کیا تعریف ہے، کیا فضائل ہیں؟ کیا ہم اس کے بغیر معاشرے میں باعزت زندگی گزار سکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

٤- تفصیل وتشریح:

توکل وقناعت کا معنی، فضائل، مختلف درجات، غلط فہمیوں کا ازالہ، شبہات کا جواب، حدیث کے فوائد ونکات اور توکل کے واقعات وحکایات کو مربوط انداز میں بیان کیجیے۔

۵- ہمارے لیے پیغام:

توکل وقناعت بہت اعلیٰ صفت اور ہماری دینی ضرورت ہے۔ اس سے زندگی کے مختلف مواقع میں ہمیں باعزت مقام نصیب ہوتا ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔

٦- دعائیہ کلمات:

اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ آپ کے درس کو قبولیت اور نافعیت عطا فرمائے۔ آپ کو اور تمام سامعین کو فہم حدیث اور عمل بالحدیث کی نعمت، اور اخلاق نبویہ سے آراستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

۷- تشنگی دور کیجیے:

آخر میں سوال وجواب کی محفل کو پروقار اور علمیت سے بھرپور انداز میں منعقد کر کے سامعین کے اذہان وقلوب کی تشنگی اپنے علم اور دردِ دل کی پھوار سے دور کرنے کی کوشش کیجیے! اور یاد رکھیے کہ ایسا اس وقت ممکن ہے جب آپ نے بھرپور مطالعہ کیا ہو۔ درسی بھی اور

خارجی بھی۔اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔آمین۔

آخری گزارش

نابغۃ العصر، خادم الحدیث، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ''معارف الحدیث'' کی ہر جلد کے شروع میں حدیث شریف کا مطالعہ کرنے کے شائقین کو ایک نصیحت بلکہ وصیت بار بار کی ہے۔یہاں اسے درسِ حدیث دینے اور سننے والوں کے لیے من وعن نقل کیا جاتا ہے:

اپنے باتوفیق ناظرین سے آخری گزارش یا وصیت

"پہلی جلد کے دیباچہ میں بھی یہی کہا گیا تھا اور اب بھی یہی ہے کہ حدیث نبوی کا مطالعہ صرف اضافۂ معلومات کے لیے اور "علمی سیر" کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لیے، رشد وہدایت حاصل کرنے اور عمل کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ نیز درس ومطالعہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کو دل میں بیدار کیا جائے اور اس طرح توجہ اور ادب سے پڑھا سنا جائے کہ گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں ہم حاضر ہیں اور آپ فرما رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں۔اگر ایسا کیا گیا تو قلب وروح کو ان انوار وبرکات اور ایمانی کیفیات کا کچھ نہ کچھ حصہ ان شاء اللہ ضرور نصیب ہوگا جو عہد نبوی کے ان خوش نصیبوں کو حاصل ہوئی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست روحانی وایمانی استفادہ کی دولت عطا فرمائی تھی"۔

لیکچر کی تیاری

کسی سیمینار میں لیکچر دینا خطابت کی سنجیدہ ترین شکل اور اہم ترین صورت ہے۔ اس کے لیے خوب تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی عام علمی مذاکرے میں پہلے سے تیار ہوئے بغیر لیکچر دینا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک مضامین اور ان کی ترتیب اسپیکر کے ذہن نشین نہ ہو وہ اچھا لیکچر نہیں دے سکتا۔ جو لوگ تیاری کیے بغیر لیکچر کے لیے ڈائس پر پہنچ جاتے ہیں وہ عموماً ناکام رہتے ہیں۔ تیاری کے لیے مواد حاصل کرنے کے ذرائع وہی ہیں جو تقریر کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں یعنی کتابیں، انسائیکلوپیڈیا، سی ڈیز اور انٹرنیٹ، نیز اس مواد کی ترتیب کا طریقہ بھی وہی ہے جو تقریر کے مواد کی ترتیب میں بیان ہوا۔ یہاں ہم اس مرتب مواد کی مدد سے لیکچر دینے کا طریقہ بیان کریں گے۔ عموماً اس کے تین طریقے استعمال کیے جاتے ہیں:

۱- بعض لوگ محض اپنی قوت تخیل و حافظہ سے کام لیتے ہیں۔ تقریر کی پوری ترتیب کو پہلے سے ذہن نشین کر لیتے ہیں اور اپنی قوت حافظہ کی مدد سے کام لیتے ہیں۔ یہی طریقہ عام طور پر ہمارے علمائے کرام کا رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ہمارے وہ اکابر جن کی علمیت اور جادو بیانی آج زبان زد خاص و عام ہے، کوئی یادداشت اپنی تقریر کے لیے نہیں بناتے تھے۔ یہ لوگ محض قوت تخیل و حافظہ اور ذہنی استعداد سے کام لیتے تھے اور ان کا کمال یہ تھا کہ وہ اس میں ہر اعتبار سے پوری طرح کامیاب رہتے تھے۔

۲- اہلِ مغرب کا طرز ذرا مختلف ہے۔ اہلِ یورپ اور ان کے مقلدین جو لیکچر دینا

چاہتے ہیں اس کو پہلے سے لکھ لیتے ہیں اور از بر کر لیتے ہیں یا اس کے مضامین کو دوہرا کر ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ نو آموز خطیبوں اور بہت زیادہ فطری استعداد اور بہترین حافظہ نہ رکھنے والے مقررین کے لیے اس طریقہ سے بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور لیکچر دینے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ تلاشِ الفاظ، ترتیب مضامین، ادائے مطلب وغیرہ کی سب رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ذہنی استعداد کمزور ہونے کی وجہ سے یہی طریقہ آج کل عموماً رائج ہے۔

۳- بعض لوگ پوری تقریر نہیں لکھتے، بلکہ اپنی تقریر کی ایک اسکیم اور پلین قائم کر کے اس کا ایک خلاصہ بنا لیتے ہیں اور مضامین کے عنوانات اور اشارات لکھ لیتے ہیں اور اسی کی مدد سے تقریر کرتے ہیں۔ یہ درج بالا دونوں طریقوں کے بیچوں بیچ ایک درمیانی طریقہ ہے۔ اگر اشارات کی طرف بار بار زیادہ دیر تک نہ دیکھا جائے جس سے سامعین پر بُرا اثر پڑتا ہے تو عموماً یہ کامیاب اور مفید ہے۔

بہر حال طریقہ کوئی بھی ہو، یہ امر ضروری ہے کہ لیکچر کئی بار دوہرا لیا جائے اور جب تک پورے طور پر ذہن نشین نہ ہو جائے، اس وقت تک ڈائس پر نہ جایا جائے۔ مغربی دنیا میں عموماً تمام لیکچرار لیکچر کو لکھ کر از بر کر لیتے ہیں۔ شریڈن اپنی تقریر کو اتنا دیاد کرتا تھا کہ جس شخص کو اس کے حالات سے پوری آگاہی نہیں، وہ ہرگز اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ایک نامور جادو بیان یورپی خطیب کا یہی حال تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''دوستو! الہام کا زمانہ گزر گیا۔ میری جادو بیانی، میری یادداشت (خلاصہ) پر مبنی ہے۔'' ایک خطیب چند پُر جوش جملے پہلے سے یاد کر لیتا تھا اور اپنی تقریر میں موقع ومحل سے چسپاں کر دیتا تھا۔ اس کو جس روز لیکچر دینا ہوتا اس سے ایک روز پہلے سب دلائل کو نوٹ کر لیتا تھا اور دل ہی دل میں کئی بار دوہرا لیتا تھا۔ لارڈ میکالے تو اپنی اسپیچ کو لفظ بلفظ یاد کر لیتا تھا اور اس پر بعض وقت مرعوب ہو جاتا تھا۔ الگزنڈر ہملٹین جو ایک نامور وکیل تھا، اپنی بحث کو پہلے سے لکھ لیتا تھا۔ روفس

اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا: ''اگر یہ چاہتے ہو کہ تقریر جاندار و صحیح ہو اور عوام مرعوب نہ ہوں نہ کہ تم، تو تقریر کو لکھ کر پہلے سے حفظ کرلیا کرو۔''

ایک زمانہ میں اس حوالے سے ایک رپورٹر کا انتہائی دلچسپ فیچر شائع ہوا۔ اس نے لکھا کہ ایک مرتبہ ایک مشہور لیکچرار کی اسپیچ کی رپورٹ لکھنا میرے ذمے ہوا، لیکن لیکچرار نے اس تیز رفتاری سے تقریر کی کہ میں اسے لکھ نہ سکا۔ بہت پریشان تھا کہ کیا کروں؟ بالآخر لیکچرار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانی ظاہر کی۔ انہوں نے میرے حال پر رحم فرما کر ایک نوٹ بک چپکے سے میرے حوالہ کی اور کہا کہ اس سے اپنا کام نکال لو، لیکن خبردار اس کا حال کسی سے نہ کہنا۔ میں نے دیکھا تو اس میں لفظ بلفظ ان کا لیکچر موجود تھا۔ نامہ نگار نے اس قسم کے اور بہت سے قصے اپنے آرٹیکل میں درج کیے تھے۔

آخری سوال

یہ سوال اکثر پیدا ہوتا ہے کہ جب درس، تقریر یا لیکچر کی بنیاد زیادہ تر تحریر پر ہے تو کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے ادیب اس میں ناکام رہے؟ گبن اور ایڈیشن کی تحریری صلاحیت میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ مگر یہ لوگ تقریر میں بہت بُرے طور سے ناکام رہے۔ پوپ کی پبلک جلسوں میں زبان بند ہو جایا کرتی تھی اور ارونگ تو تقریر کے وقت گونگا ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سمجھنا بہت آسان ہے۔ تحریر اور تقریر کی زبان میں بہت فرق ہے۔ تحریر میں بندش الفاظ، صحت محاورات، فصاحت و بلاغت کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ تقریر میں حاضر دماغی، قوت تخیل، اطمینان قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ جو چیزیں انسان کو عمدہ ادیب بنا سکتی ہیں وہ اس کو عمدہ خطیب نہیں بنا سکتیں۔ تحریر اور تقریر دونوں الگ الگ فن ہیں۔ ادب اور خطابت دو مختلف دریا ہیں جن کے پانی کا ذائقہ اور وہ عناصر جن سے یہ پانی وجود میں آتا ہے، ملتے جلتے تو ہیں لیکن بالکل یکساں نہیں۔ یہ دونوں دریا ساتھ ساتھ بہتے تو ہیں لیکن اکٹھے کم ہی ہوتے ہیں۔ ان کے سنگم کا دیدار کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے اور اصل بات یہ ہے کہ انسان کو ادیب یا خطیب بننے کی خواہش پالنے کے بجائے دین کی دعوت دینے اور دین کا خادم بننے کی شدید حرص رکھنی چاہیے اور اس کے لیے اسباب کے درجے میں تحریر و تقریر کے اصول و آداب اپنا کر مشق کرتے رہنا چاہیے۔ اساتذہ کا ادب اور علم کا ادب کرتے ہوئے دعا اور جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اس خلوص، نیک نیتی اور محنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ جس کے لیے جو شعبہ مناسب ہو، اس کی راہیں اس پر کھول دیتے ہیں اور اس

سے اسی میدان میں عافیت کے ساتھ کام لے لیتے ہیں۔

یاد رکھیے! ہر چیز کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہوتا ہے اور ہر چیز نے بالآخر لوٹ کر اللہ رب العزت کی طرف جانا ہے، اس لیے ''قابلیت'' حاصل کرنے سے پہلے 'قبولیت'' کا فیصلہ کروانے کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ اپنی خاص توفیق آپ کے اور ہم سب کے شاملِ حال فرمائے۔ آمین۔

آخری بات

فن تقریر میں کامیابی کا راز

آخر میں ہم عزیز طلبہ کو یہ بتائے دیتے ہیں کہ کسی فن میں توکل وتفویض، اطمینانِ قلب اور خود اعتمادی (سیلف کانفیڈنس) کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ درس اور تقریر میں ہے۔ جب تک انسان کو اپنے خدا پر اور اس کی دی ہوئی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ نہ ہو اور فریضۂ دعوت کی ادائیگی میں وہ خدا پر توکل کر کے نہ کھڑا ہو، وہ تقریر یا لیکچر میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ داعی اور مدرس یا مبلغ پر فرض ہے کہ وہ درس یا تقریر کے وقت تمام خوف وشرم کو اپنے دل سے نکال پھینکے اور اللہ کی مدد میں کسی قسم کا شبہ یا وہم نہ رکھے، ورنہ ماحول اور حاضرین سے مرعوب ہو جائے گا اور اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ یہ بات دعا، اخلاص اور مشق سے وقت کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتی ہے اور درحقیقت یہی فنِ تقریر میں کامیابی کا ''اصل راز'' ہے۔

ہم اسی پر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی دولت اور دعوتِ دین کے جذبے اور صلاحیتوں سے مالا مال فرمائے اور ہم سب سے دین کی خدمت کا خوب خوب کام لے۔ یہی ہماری دلّی تمنا، یہی ہماری قلبی آرزو اور یہی ہمارے ارمانوں کا محور ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمدللہ ربّ العالمین

چند نمونے

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بنیادی مقصد

تعلیمِ علم

اور

تکمیل اخلاق

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

یہ تقریر ۲۵ نومبر ۱۹۵۶ء میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ
برن پور، ضلع بردوان کے وسیع ہال میں کی گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ و کفی، و سلام علی عبادہ الذین اصطفی.

أما بعده!

محترم حضرات!

یہاں کی حاضری کے سلسلہ میں آپ نے اپنے سپاسنامہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں اس عزت افزائی پر آپ کا شکر گذار ہوں۔ اس قسم کے خیالات میرے لیے حوصلہ افزائی کا سبب ہیں۔

شی اپنے معدن میں:

اس طرح کے مدارس کے سلسلہ میں کسی طالب علم کا آنا دراصل شے کا اپنے معدن میں چلا آنا ہے۔ جیسے مچھلی پانی میں جا کر خوشی محسوس کرتی ہے، اسی طرح ایک طالب علم مدرسہ میں آکر خوشی محسوس کرتا ہے۔ بالخصوص آپ کا یہ مدرسہ جو حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی سرپرستی میں چل رہا ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مدرسہ دارالعلوم ہی کا مظہر وظہور ہے۔ اس لیے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے کسی حصہ میں کھڑا ہو کر تقریر کر رہا ہوں، اس لیے جذباتِ تشکر کے ساتھ ساتھ مسرت بھی ہے۔

مجھے اپنے سفروں میں کوٹھیوں اور بنگلوں میں بھی قیام کا اتفاق ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو قلبی مسرت، روحانی سکون اور خوشی کسی درسگاہ میں پہنچ کر اور اپنے عزیز طلبہ میں مل جل کر رہنے میں ہوتی ہے، سچ پوچھئے تو کوٹھیوں میں میسر نہیں آتی۔

اہم ترین مقصد:

حضرات! اسلامی نقطۂ نگاہ سے تعلیم سب مقاصد سے اقدم اور اہم المقاصد بلکہ تمام مقاصد کی روح ہے۔ اسی لائن سے مسلمان آگے بڑھے، خواہ تعلیم عام ہو یا خاص، اس نے ہی مسلمانوں کو ہمیشہ آگے بڑھایا ہے۔ اسی کے ساتھ جب کمالِ اخلاق شامل رہیں تو دینی و دنیوی ترقیات کی تمام راہیں کھل جاتی ہیں۔

بعثت نبوی ﷺ اور تعلیم علم:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد دو چیزیں بتائی ہیں۔ ایک تعلیم اور علم اور دوسرے تکمیل اخلاق۔ تعلیم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا''. اور تکمیل اخلاق کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْلَاقِ''. جس کا حاصل یہ نکلا کہ بعثت کا پہلا مقصد تو تعلیم ہے اور دوسرا مقصد تربیت، یعنی علم اور اخلاق ہی پھیلانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے، اسی لیے قرآن کی جو پہلی آیت نازل ہوئی وہ تعلیم و تعلم سے ہی متعلق ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ''. گویا اولین مقصد اسلام کا یہ تھا کہ پڑھو! اور کیا پڑھو؟ پڑھو پروردگار کے نام سے یعنی وہ علم پڑھو جس میں رب کا نام پہلے آئے۔ اور رب کی معرفت ہو کہ وہی خالق ہے، وہی کریم و اکرم ہے اور وہی معلم ہے۔ قول سے بھی اور قلم سے بھی۔

سب سے بڑا مرض:

بزرگو! جہالت سے بڑھ کر کوئی دوسرا روگ نہیں ہے۔ سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے پہلے عرب میں ہر طرح کی برائیاں تھیں۔ زنا کاری عام تھی، فحش کاری کا بازار گرم تھا، جھوٹ اور ڈاکہ زنی کو مردانگی کا جوہر سمجھا جا رہا تھا، لیکن اس دور کو ان

برائیوں کی طرف منسوب نہیں کیا گیا یعنی اس دور کو زمانۂ فحش کاری یا زمانۂ زنا کاری وغیرہ کا دور نہیں کہا گیا، جھوٹ اور ڈاکہ زنی کا دور نہیں کہا گیا۔ نہ اس کو فسق و فجور کا زمانہ کہا گیا، بلکہ اس کو براہ راست جہالت کی طرف منسوب کر کے زمانۂ جہالت کہا گیا جس سے واضح ہے کہ تمام شر و فساد کی جڑ، بنیاد جہالت ہے اور اس کا دفعیہ ہی تمام مفسدوں کا دفعیہ ہے۔

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں تشریف لا کر جہالت کی تاریکیوں کو دور کیا اور دنیا کو ایمان اور علم کی روشنی سے منور کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین حکم بھی ہوا کہ جہالت کو دفع کرو۔﴿اقرأ باسم ربك الذی... إلخ﴾

بعثت نبوی ﷺ اور تکمیل اخلاق:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی دوسری غرض تکمیل اخلاق بتائی اور فرمایا:"بعثت لأتمم مکارم الأخلاق". یعنی میری بعثت کا مقصد کمال اخلاق سکھا کر مخلوق کو خلیق بنانا ہے۔ علم بلاشبہ روشنی ہے جس سے راہ نظر آتی ہے، مگر چلنے کی طاقت اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا سر چشمہ محبت ہے اور محبت روح ہے ایمان کی، جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"لایؤ من أحد کم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین".

ترجمہ: تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کے باپ اس کے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اسی لیے پہلے ایمان پیش فرمایا گیا۔ پھر علم کی روشنی اور اخلاق کی طاقت پیدا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حکمت کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ جیسے سیکڑوں من بوجھل گاڑی کو انجن کھینچتا ہے لیکن انجن کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک لوہے کی لائن اور دو پٹڑیوں والی سڑک اور دوسرے اسٹیم یعنی بھاپ کی گرم طاقت۔ ان ہی دو کے ذریعہ انجن منزل مقصود تک پہنچ

سکتا ہے اگر اسٹیم نہ ہو۔ صرف لائن بچھی ہوئی ہو تو آپ اسے ٹھیل ٹھیل کر کہاں تک چلائیں گے۔ بالشت بھر چلے گا، پھر کھڑا ہو جائے گا اور اگر صرف اسٹیم ہو لیکن لائن نہ ہو تو انجن اسٹیم کی طاقت کی وجہ سے جتنا تیز چلے گا اتنا ہی زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا، لیکن جب دونوں جمع ہو جائیں کہ لائن بھی سیدھی اور صاف ہو اور اندر اسٹیم کی طاقت بھری ہوئی ہو تو انجن چلے گا تو اپنے ساتھ سیکڑوں من بوجھل گاڑی کو کھینچ کر منزل تک پہنچا دے گا۔ ٹھیک اسی طرح ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے سیدھی لائن کی ضرورت ہے وہ علم شریعت ہے۔ اور ایک یہ کہ اس کے اندر عشق الٰہی اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اسٹیم بھری ہوئی ہو، اگر عشق و محبت نہ ہوا سے وعظ و نصیحت سے کب تک ٹھیل ٹھیل کر چلایا جائے گا اور اگر عشق و محبت ہو مگر علم کی لائن نہ بچھی ہوئی ہو تو جتنا زور سے چلے گا اتنا ہی جہالت کی وجہ سے بدعات و منکرات کی زمین میں دھنستا چلا جائے گا، لیکن علم و عشق دونوں جمع ہو جائیں گے تو یہ کامل الایمان منزل خداوندی تک چلے گا۔ اور جو اس سے بندھ جائے گا، اسے کھینچ کر وہیں پہنچا دے گا۔

پس معلوم ہوا کہ منزل تک پہنچنے کے لیے لائن اور اسٹیم ضروری ہے لائن علم ہے اور اسٹیم محبت ہے جو عشق الٰہی اور عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے انسان عرش تک پہنچتا ہے۔

مدرسہ اور خانقاہ کی حقیقت:

جہاں علم سیکھنے اور سکھانے کا کام ہوتا ہے اس کو اصطلاح میں "مدرسہ" کہتے ہیں اور جہاں اخلاق کی طاقت پیدا کی جاتی ہے اس کا نام "خانقاہ" ہے۔ مدرسہ کا موضوع روشنی پیدا کرنا ہے اور راہ دکھانا ہے۔ ساتھ ہی وسیع الخیال بنانا بھی، جس کے نتیجہ میں جرأت حق، صاف گوئی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور خانقاہ میں اخلاق اور کیریکٹر کی طاقت پیدا کی جاتی ہے جس سے اس راہ حق گوئی میں چلنا اور دوڑنا ممکن ہو جاتا ہے، مگر

افسوس کہ اس زمانہ میں ایسی خانقاہوں کا وجود اقل قلیل ہے۔ اب خانقاہوں میں اخلاق ربانی پیدا کرنے کا کام تقریباً ختم ہے، حالانکہ ان کا اصل موضوع تبلیغ حق اور راہ حق میں جاں سپاری تھا، جن کے طفیل ہندوستان میں اسلام پھیلا، اسی طرح ایسے مدارس بھی کم ہیں جن میں پہلے جیسا کام ہوتا ہو۔ دونوں کی کمی سے امت کی بنیاد کمزور ہوتی جارہی ہے اور مدارس کے قیام کی تحریک پھیکی پڑتی جارہی ہے، حالانکہ تعلیم اور تربیت اخلاق کی تحریک، نبوت کی بنیادوں کے قائم کرنے کی تحریک تھی۔

حقیقی آفتاب و ماہتاب:

حقیقی آفتاب و ماہتاب یہی دو روشنیاں تھیں جنہیں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور بائیں ہاتھ میں چاند، لیکن یہ مادی سورج اور چاند نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں اس مادی آفتاب سے زیادہ چمکنے والا اور کبھی نہ غروب ہونے والا سورج اللہ کی روشنی کتاب تھی اور بائیں ہاتھ میں اس چاند سے زیادہ چمکنے والا قلب تھا جن میں اخلاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی اور کلام خداوندی کا جلال بھرا ہوا تھا۔ یہ جلالی روشنی جب قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہو کر گذری اور اس میں اخلاق عبدیت کی ٹھنڈک شامل ہوئی تو یہ روشنی ٹھنڈی اور معتدل ہو کر دنیا کے سامنے آئی۔ اگر بغیر نبوت کے یہ جلالی روشنی دنیا کو دی جاتی تو اس کا جلال وعظمت دنیا کو جلا کر پھونک دیتا اور کوئی تحمل نہ کرسکتا، لیکن قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی مسکنت وعبدیت نے اسے مخلوق کے لیے قابل تحمل بنادیا اور وہ ٹھنڈی روشنی کی صورت سے جلوہ گر ہوئی۔ بہر حال اللہ کی روشنی جلالی تھی اور قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی جمالی۔ ان دونوں کے مل جانے سے اعتدال اور نرالی روشنی دنیا کے لیے نمودار ہوئی جس میں محبت، میل ملاپ، ہمدردی، تواضع، ایثار اور تمام کمالات

علم واخلاق بھرے ہوئے تھے جن میں ہر مخلوق سے ہمدردانہ برتاؤ کا حکم دیا گیا تھا۔ ملائکہ کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا حکم ہے، ارشاد خداوندی تعالیٰ ہے: ﴿قل من کان عدوًا لجبريل؛ فإنه نزله على قلبك بإذن الله".

ترجمہ: "آپ فرمادیجیے جو کوئی ہوئے دشمن جبریل علیہ السلام کا، سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے"۔ جنّات کے ساتھ ہمدردی کا حکم تھا کہ ہڈی سے استنجا نہ کرو! اس لیے کہ اس میں تمہارے بھائی جنوں کی غذا ہے۔ اسی طرح کوئلہ سے استنجا کو منع فرمایا کہ اس میں بھی اجنہ کے لیے غذائی مادے موجود ہیں۔

جانوروں کے ساتھ ہمدردی:

جانوروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کے واقعات تو کتب میں بکثرت ہیں۔ ایک اونٹ ایک مرتبہ خدمت مبارکہ میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں اور زبان پر فریاد کی بلبلاہٹ تھی اور وہ نہایت ہی لاغر و ناتواں ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے مالک کو طلب فرمایا اور اسے عرض کیا: "یہ شکایت کر رہا ہے کہ تو اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالتا ہے"۔ اس نے جرم کا اقرار کیا اور آئندہ کے لیے توبہ کی۔

غرض اس دین کی روشنی میں جانور تک کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حقوق تک کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر نہ صرف حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی ہمدردی اور محبت کا حکم دیا گیا ہے۔ نہر کے کنارے بیٹھو تو بلاضرورت پانی نہ بہاؤ! وضو بھی کرو تو اسراف نہ کرو! بہر حال یہ تمام احکام رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے وابستہ ہیں جن میں خلق اللہ کے ساتھ ہمدردی اور ان پر شفقت کی تاکید کی گئی ہیں، مگر اسی کے ساتھ جلالی شانیں بھی قائم ہیں کہ اس کے بغیر دین میں اعتدال قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

عدل ومساوات کی اعلیٰ مثال:

جہاں یہ شفقت ومحبت وہمدردی ہیں وہیں اسی رحمۃ اللعالمین کی شریعت میں جرائم پر حدود وقصاص کے احکام بھی موجود ہیں۔ جس میں کسی سفارش کو جائز نہیں رکھا گیا ہے اور اس درجہ مساوات رکھی گئی ہے کہ اس میں بڑا اور چھوٹا سب برابر اور انصاف کی نگاہ میں اعلیٰ وادنی سب یکساں ہیں یہاں تک فرمایا گیا: "لَوْ أنَّ فَاطمة بنت محمدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا". اسی رحمت عالم کی شریعت میں جہاد بھی موجود ہے جس سے فتنہ پردازوں کے فتنوں کو دبایا گیا۔

جامع شریعت:

بہرحال یہ شریعت جامع شریعت ہے جس میں جلال وجمال دونوں کی رعایت کی گئی ہے گویا جلال وجمال کو ملا کر شریعت محمدی کی تعمیر کی گئی ہے کیونکہ عمل کی دنیا میں نہ تو جلال محض سے کام چل سکتا ہے اور نہ جمال محض سے مقصود حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر آقا اپنے غلام پر ہر وقت غصہ اور عتاب ہی کرتا رہے۔ خواہ وہ اطاعت کرے یا مخالفت، تو غلام بددل ہوکر کام چھوڑ بیٹھے گا اور اس کے اندر پھر کام کرنے کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے گا۔ وہ کہے گا کہ کام کروتب بھی جوتیاں ہی لگتی ہیں نہ کروتب بھی مار کھانی پڑتی ہے تو کیوں عمل کی محنت سے اپنی جان کو سوہان بنایا جائے اور اگر آقا ہر وقت جمال ہی جمال میں غرق ہے اور غلام پر شفقت ہی شفقت کرتا ہے تب غلام کا کام معطل ہوجائے گا کیونکہ وہ سوچے گا کہ جب آقا بے عملی پر بھی خفا ہونا نہیں جانتا ہے تو پھر عمل کی محنت کیوں اُٹھائی جائے۔ غرض جلال محض بھی عمل میں تعطل پیدا کرتا ہے اور جمال محض بھی عملی قوت کو ختم کردیتا ہے، جب جلال وجمال دونوں ملے ہوئے ہوں کہ کرنے پر صلہ کی توقع ہے اور نہ کرنے پر سزا کا اندیشہ، تب ہی عمل کی قوت اُبھر کر کام کرتی ہے۔

عملی قوتوں میں بیداری کا مبنیٰ:

خلاصہ یہ نکلا کہ امید وبیم اور خوف ورجا کے ملنے ہی سے عملی قوتوں میں بیداری آتی ہے اور ایمان نام اسی خوف ورجاء کے مجموعہ کا ہے۔ نہ امید محض کا نام ایمان ہے کہ آدمی بیٹھا ہوا اللہ سے امیدیں باندھتا رہے اور نہ خوف محض کا نام ایمان ہے۔﴿الإیمان بین الخوف والرجاء﴾ (ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے) اس لیے قرآن مجید نے دو جملے استعمال فرمائے ہیں جن میں اسی درمیانی حالت کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿لَاتَيْئَسُوا مِنْ رَوحِ اللّٰه، إِنَّهُ لَايَيْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ.﴾

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس سے مایوس ہونے والے کفار ومنکرین ہوا کرتے ہیں۔"

ہمیں تو شدائد کے وقت بھی امید باندھنے اور آس لگائے رکھنے کا حکم ہے، اس لیے کہ خدا کی قدرت لامحدود ہے۔ فرائض کے بعد اللہ سے امید باندھے رکھنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ اسباب محض پر امیدیں باندھنا تو ایک قسم کا شرک ہے، مگر مسبب الاسباب سے دنیا میں کشائش کی امیدیں باندھنا اور آخرت میں جنت کی توقع رکھنا نہ صرف ثواب بلکہ عین ایمان ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ بیماری کی عیادت کے وقت بھی مریض کے بدن پر ہاتھ پھیر کر کہو: "لَا بَأسَ طَهُوْرٌ." مت گھبراؤ ان شاء اللہ یہ مرض بھی تمہارے حق میں پاکی کا ذریعہ ثابت ہوگا جس سے تم گناہوں کی کدورت سے اور بدن کے مادی روگ سے پاک ہو جاؤ گے، مگر جہاں پر ہمہ وقتی امید بتلائی وہیں قرآن مجید نے ایک دوسرا جملہ بھی کہا ہے: ﴿لَايَأمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ.﴾ (اللہ کی مخفی تدبیروں سے بے فکر نہ ہو جاؤ کہ بے فکر ہو کر بیٹھ جانے والے گھاٹے والے ہیں)

پس پہلی آیت میں مایوسی سے روک کر رجاء وامید کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسری آیت میں بے فکری سے ہٹا کر فکرمندی اور خوف کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس انہیں دونوں کے

مجموعہ سے ایمان بنتا ہے۔گویا ان دونوں آیات کا مجموعہ ایمان ہے،لہٰذا یہ حقیقت اب نکھر کر سامنے آ گئی کہ شریعت میں جلال و جمال دونوں ہیں، اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جامع اخلاق اور اپنی جامع تعلیم سے جلال و جمال کی گرم اور ٹھنڈی روشنی دونوں پیش فرمائی۔ٹھنڈی روشنی اخلاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور گرم روشنی کلام ربانی ہے۔ایک روشنی تعلیم کتاب سے ملتی ہے اور ایک تربیت اخلاق سے ہاتھ آتی ہے۔ایک کے لیے مدرسہ کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لیے خانقاہ کی۔

اسی لیے نہ تنہا مدرسہ کی تعلیم کافی ہے اور نہ تنہا خانقاہ کی تربیت۔ بلکہ دونوں ہی کی ضرورت ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو تعلیم سے بھی زیادہ ضرورت تربیت کی ہے، کیونکہ تربیت بغیر اخلاق کے درست نہیں ہوتی اور تزکیۂ اخلاق کے بغیر عبدیت نہیں آتی جو تخلیق انسانی کا اصل مقصود ہے۔

حضور ﷺ کی رفعتِ شان اور شانِ عبدیت:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا اعلم البشر و اعلم الاوّلین والآخرین ہی نہیں ہیں بلکہ اعبد الخلائق اور سید المتواضعین بھی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا ایک پاک اثر ہے، علم رفعت اور سر بلندی کو چاہتا ہے اور خلق عبدیت اور تواضع کو۔ اگر علم کے ساتھ عبدیت شامل نہ ہو تو انسان میں تعلّیٰ اور ترفع پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے لیے مہلک ہوتا ہے پس علم کے ترفع کا نتیجہ عبدیت ہے جو تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق میں یکتا اور بے مثال ہیں، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت میں بھی یکتا اور بے مثال ہیں۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی معبودیت میں وحدہٗ لاشریک لہٗ ہیں ٹھیک اسی طرح اس کا محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت میں وحدہٗ

لاشریک لہٗ ہیں۔ اللہ، اللہ ایک طرف تو علوِ مرتبت کا یہ عالم کہ ارشاد خداوندی وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کی بنا پر فرمایا جاتا ہے:

"أنا سيّد ولد ادم يوم القيٰمة ولا فخر، وبيدى لواء الحمد ولا فخر، وما من نبي يومئذٍ آدم فمن سواه إلاتحت لوائى، وأنا أوّل من تنشق عنه الأرض ولافخر".

میں قیامت کے دن تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور یہ بات اترانے کی نہیں ہے اور میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور یہ اترانے کی بات نہیں اور اس دن ہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم آدم ہوں یا ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

اور میں پہلا شخص ہوں جس کی قبر کی زمین کھلے گی، اس میں بھی کوئی اترانے اور فخر کی بات نہیں ہے۔

اپنی عبدیت کو اس طرح اجاگر فرمایا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر ہر گوشہ سے شان عبدیت نمایاں ہے کھانے میں، پینے میں، چلنے میں، پھرنے میں، پہننے میں، اوڑھنے میں، غرض زندگی کے ہر گوشہ میں عبدیت کا مظاہرہ ہے کھاتے ہیں تو چوکڑا مار کر کبھی نہیں کھاتے، بلکہ دوزانوں بیٹھ کر کھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ اکل کمایا کل العبد میں تو اس طرح سے کھاتا ہوں جس طریقے سے غلام کھاتے ہیں، چلتے ہیں تو آنکھیں نیچی کر کے یہ دوسری بات ہے کہ خدا نے اپنے نبی کو اتنا بلند مقام دیا تھا کہ چلتے وقت میانہ قد ہونے کے باوجود سب سے اونچے نظر آتے تھے۔ یہی کیفیت مجلس میں ہوا کرتی تھی، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام میں مل جل کر بیٹھنے کے عادی تھے، مگر اس میں بھی آپ سب سے اونچے نظر آتے تھے، یہ اللہ کی دی ہوئی بڑائی تھی۔ صحابۂ کرام نے تعظیم کے لیے کھڑا ہونا چاہا تو فرمایا۔ جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جایا کریں تو اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے۔

کبھی یہ فرمایا:"لاتقوموا لی کما یقوم الأعاجم". (میرے لیے مت کھڑے ہو جس طرح کہ عجمی لوگ [اپنے بادشاہوں کے لیے] کھڑے ہوتے ہیں۔)

نصب العین کی بلندی اور اس کا راز:

یہی کردار کی بلندی ہے جو افراد ہی کو نہیں اقوام کو بھی سربلند کرتی ہے کیونکہ قوموں کی ترقی مال وزر اور مادی چیزوں سے نہیں ہوتی، بلکہ نصب العین کی بلندی اور کردار کی مضبوطی سے ہوتی ہے اور کردار علم اور حسنِ اخلاق سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اپنے سامنے ایک نصب العین رکھ کر اس کی کامیابی کے لیے اپنی طاقت کے مطابق آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا چاہیے۔ کسی مدرسہ کا قیام نبوت کی تعلیم کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے آج میں اپنے اس معدن (مدرسہ اسلامیہ عربیہ برن پور) میں پہنچ کر جہاں بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں وہیں نبوت کی بنیادی تعلیم اور قرآنی احکام کی روشنی میں کارکنان مدرسہ کو کچھ مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔

مدرسہ کے نظام میں قرآن کی رہنمائی:

مدرسہ کے نظام میں سب سے بڑی چیز طلبہ کے لیے ڈسپلن اور ان کی اطاعت شعاری ہے۔ ایک مدرسہ ہی نہیں کسی بھی کام کے لیے نظم وتنظیم کا اصول اور طریقۂ کار لازمی ہے اور مدارس اس کے زیادہ مستحق اور مقتضی ہیں۔ مدارس کے نظام کے سلسلہ میں خود قرآن مجید نے زبردست رہنمائی فرمائی ہے۔ طلبہ کے داخلہ و خارجہ تک کی نشاندہی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اس قصہ سے ملتی ہے جس کو قرآن نے کافی تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ کے لیے پہنچے۔ تو سب سے پہلے حضرت خضر علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ کیا میں آپ کی پیروی میں آپ سے کچھ سیکھ سکتا ہوں؟ ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ یہ ایسا ہے

جیسے داخلہ کی درخواست دی جاتی ہے۔ اس پر انہوں نے اولاً انکار کیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے اصرار پر ان کی رفاقت اور استفادہ منظور کرلیا، مگر کچھ شرطیں لگا کر، یہ ایسا ہے جیسا کہ مدارس میں داخلہ کی شرائط اور ڈسپلن کی پابندی کی شرطیں تحریری یا زبانی کی جاتی ہیں جس کا حق اس واقعہ سے ان کے لیے ثابت ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام وہ شرطیں پوری نہ فرما سکے تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ﴾ یہ ایسا ہے جیسا کہ طالب علم کا اخراج، ظاہر ہے موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں جلیل القدر لیکن ڈسپلن اور نظم کے بارے میں فریقین میں سے اس صفائی پر نہ کوئی برا مانتا ہے اور نہ چیں بجبیں ہوتا ہے جس سے نظام بجائے خود قائم رہتا ہے اور اصولوں کی کامیابی ہوتی ہے۔

ایسے کاموں میں اگر دیانتداری کے ساتھ ہوشمندی کا ثبوت پیش کیا گیا جس کو دانش کہتے ہیں تو کامیابی اور جلدی ہوتی ہے، اس لیے تعلیم کے ساتھ نظام تعلیم کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر نتائج وثمرات برآمد نہیں ہوتے۔

جمعیۃ علماء ہند کی خدمات:

برادارانِ ملت! حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جمعیۃ علماء ہی مسلمانوں کے لیے ایک عظیم پناہ گاہ ہے جس طرح ۵۷ء میں بھی تعلیم ذریعہ پناہ ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت ملک کی جو فضا ہے اس میں اپنے معاملات کے سدھار کے لیے احتجاج اور جذباتی تقریریں مفید نہیں ہیں، بلکہ بہت خاموش طریقے سے قوم وملت کی تعمیر میں اپنی تمام تر قوت کو صرف کردینا ہی اصلاح حال کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں آزادیٔ وطن کے بعد جمعیت علمائے ہند نے مسلمانوں کی تعمیر اور دینی تعلیم کی بقاء اور اشاعت کے لیے جو خاموش خدمات انجام دی ہیں ان کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی ایمانی فراست اور دینی بصیرت:

میں آپ کو وہ دور یاد دلاتا ہوں جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجہ میں ہمارے حالات حد درجہ خراب ہو چکے تھے تو اس پُر آشوب دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنی فراست ایمانی اور دینی بصیرت سے ملک کے مستقبل کو بھانپا اور مسلمانوں کو انقلاب کے ناخوشگوار نتائج سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی اور اپنے رفقاء کار کی توجہ قوم کی تعمیر کی طرف پھیر دی جس کا ظہور مدارس اسلامیہ کے قیام کی شکل میں ہوا۔ سب سے پہلے دیوبند جیسے گمنام قصبہ میں اسی تعلیم تحریک کا عملاً نفاذ ہوا۔ اور ظاہری بے سروسامانی کے ساتھ چھتہ کی ایک مسجد میں ایک انار کے درخت کے نیچے ملا محمود نامی ایک استاد اور محمود نامی ایک شاگرد سے (جس کو بعد میں دنیا نے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے نام سے جانا) دارالعلوم دیوبند کا افتتاح عمل میں آیا۔

دارالعلوم دیوبند کا عالمی فیض:

آج دیوبند کا وہی دارالعلوم ہے جس کے علمی فیض ہندوستان اور پاکستان اور تمام اسلامی ملکوں کے علاوہ ملایا، انڈونیشیا، سیلون، برما، چین، ترکستان، روس وغیرہ ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں، بلکہ بحرین، نجد و حجاز اور مدینہ منورہ و مکہ معظّمہ زادہما اللہ شرفاً میں بھی آج دارالعلوم کا علمی فیض اپنا کام کر رہا ہے۔ اس وقت ان اکابر نے علم کی یہ سبیل جاری کر کے مسلمانوں کو سنبھالا تھا۔ وہی نقش قدم آپ کے سامنے بھی ہونا چاہیے۔

حضرات! آپ نے اپنے سپاسنامہ میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس مدرسہ کی جدید عمارت کی تعمیر جنوری ۵۷ء سے شروع ہوگی، ہر چند کہ لوگ اب گذشتہ انقلاب ۵۷ء کی خوں چکاں داستان کے پیش نظر آنے والے ۵۷ء کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں، مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ ۵۷ء میں اگر کچھ لوگوں نے وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اور ملک

کو تباہ کرنے کے ساتھ مسلمانوں کی بھی تخریب چاہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہی انقلاب ۱۸۵۷ء تھا جس کے نتیجہ میں کسی کی تخریب کا صحیح جواب دینے کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام مسلمانوں کی ملی تعمیر کا باعث ہوا۔ کون ہے کہ آج اس کی خدمات کا انکار کرسکتا ہے۔ آپ بھی ۵۷ء ہی سے اپنے مدرسہ کے دورِ جدید کا آغاز کر رہے ہیں۔ خدا کرے آپ کا یہ مدرسہ بھی دارالعلوم کی طرح ایک مرکزی ادارہ ثابت ہو جس سے اس علاقہ کے لوگ اپنی علمی پیاس بجھا سکیں، مگر یہ ضروری ہے کہ قدم بہت نرم رفتار کے ساتھ احتیاط سے اُٹھایا جائے کیونکہ اسلام کا آغاز بھی یوں ہی ہوا ہے۔ کہنے کو تو آج فرزندانِ توحید ستّر کروڑ ہیں، لیکن ایک وقت وہ بھی تھا کہ خدا کی اس لمبی چوڑی زمین پر صرف تین مسلمان تھے۔ بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، عورتوں میں جناب خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، ان تین نفوس قدسیہ سے بعد میں کروڑوں تک تعداد پہنچ گئی۔ آج کروڑوں اگر صحیح معنیٰ میں ان پہلوں کے نقش قدم پر آجائیں تو تعداد کہاں سے کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

واخر دعوانا أن الحمدللّٰه رب العالمين.

نزولِ قرآن کا مقصد

اور

حاملین قرآن کی ذمہ داریاں

از

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا محترم کی ایک اہم تقریر جو دورۂ برما ۶۰ء
میں جمعیۃ الحفاظ کے ایک جلسہ میں کی گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمعیۃ الحفاظ کے اس جلسہ میں شریک ہونا میرے لیے سعادت بھی ہے اور ایک طرح کی عبادت بھی۔ اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز خواہ وہ حفظ ہو یا تجوید، تفسیر ہو یا قرآن مجید کی تلاوت، بڑی معزز اور مکرم چیز ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ساتھ ہی آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منصب نبوت کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کے سلسلے میں فرمایا ہے:

﴿هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم، یتلو علیهم آیاته، ویزکیهم، ویعلمه الکتاب والحکمة، وإن کانو من قبل لفی ضللٍ مبین﴾ (الجمعة: ۲)

(ترجمہ: وہ پاک ذات ہے جس نے کہ اَن پڑھوں میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرمایا جو ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی تربیت فرماتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے چار شعبے ہیں جو گویا فرائض چہارگانہ ہیں:

تلاوتِ آیات:

تلاوتِ آیات پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے۔ یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کے شعبوں میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا ہے۔

تزکیۂ نفس:

دوسرا شعبہ ہے یزکیهم، نفوس کی تربیت کرنا، مہذب بنانا، اخلاقِ رذیلہ نکالنا اور اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنا اور وہ صفت پیدا کرنا جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے:

﴿ولٰكِنَّ اللّٰه حَبَّبَ إِلَيكُم الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِي قُلُوبِكُم وَ كَرَّهَ إِلَيكُم الكُفرَ وَ الفُسُوقَ وَ العِصيَانَ أُولٰئِكَ هُم الرَّاشِدُونَ﴾

(ترجمہ: اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی ایسے لوگ راہ راست پر ہیں۔)

نزولِ قرآن مجید کا اہم ترین مقصد:

قرآن مجید کے نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے کہ لوگ اس کو پڑھ سکیں اور اس کو سنا سکیں۔ اس کو یاد کریں اور پڑھتے رہیں، بلکہ نزولِ قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، قلوب اور نفوس کی اصلاح ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی۔ صحابۂ کرام آپ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے۔ ان کے نفوس کیسے مصفیٰ تھے، ان کی کیسی تربیت ہو چکی تھی کہ کفر و شرک کی نفرت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی اور ایمان کی محبت اور ایثار کا مادہ ان کے اندر پیوست ہو چکا تھا۔ عبادت کا ذوق ان پر غالب آ چکا تھا۔ خدمت خلق کا جذبہ ان کے اندر نمایاں تھا۔ ان کے اندر سے نفسیات کا کانٹا نکل چکا تھا۔ جب دنیا ان کے اندر سے بالکل ناپید ہو چکی تھی۔ حبِ جاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب تزکیہ کا زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ضرار ابن عمرو رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں شرک کی حالت میں اس نیت سے نکلا کہ میں وہ کام کروں جو قریش نہیں کر سکے یعنی معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی پر دست درازی کروں، موقع اچھا تھا۔ آپ تنہا طواف کر رہے تھے۔ میں نے بھی طواف کرنا شروع کر دیا اور اس فکر میں رہا کہ ذرا کچھ موقع ہو کہ آپ کا اور

میرا سامنا ہو جائے تو میں اپنا کام کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو دیکھ کر بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ضرار تمہارا کیا ارادہ تھا؟" میں نے کہا: "کچھ نہیں۔ میں طواف کر رہا تھا، آپ ہنسے اور آپ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ خدا کی قسم! آپ نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا کہ گویا سینہ کے اندر کی ساری آلائش نکل گئی۔ اس کے بعد میں وہاں سے گھر چلا آیا۔ ایک عورت جس کے یہاں جلسہ ہوا کرتا تھا اور محفل گرم ہوا کرتی تھی اور اس میں داستان آرائی وقصہ گوئی ہوتی تھی میں رند مشرب تھا۔ اس عورت نے مجھے دیکھا تو آواز دی۔ میں نے کہا: اب کچھ نہیں ہوسکتا، اب میں مسلمان ہو گیا ہوں۔"

ایسی فوری تبدیلی کے واقعات بھی بہت ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر تین دور گذرے ہیں: ایک دور مجھ پر ایسا گذرا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر مبغوض نہ تھی۔ معاذ اللہ اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں اپنی عاقبت خراب کر لیتا۔ اللہ نے فضل فرمایا۔ موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس کے بعد دوسرا دور مجھ پر ایسا گذرا کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر محبوب نہیں تھی۔ خدا کی قسم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا، اس لیے کہ میری نظر آپ کے چہرۂ مبارک پر جمتی ہی نہیں تھی اور مجھ میں آپ کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی۔ جب میں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور بیعت کی تو میں اپنا ہاتھ نکالتا ہی نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں نے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمائیے کہ میرے گزشتہ گناہوں کا کیا ہوگا؟ میں تو بہت سیاہ کار انسان ہوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے ماقبل کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں۔ وحشی رضی اللہ عنہ جنہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ

عنہ بن عبدالمطلب اللہ کے شیر کو خود شہید کیا تھا اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ آپ کو معلوم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب وہ آئے اور انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وحشی! اگر تم میرے سامنے بار بار نہ آؤ تو اچھا ہوگا، اس لیے کہ مجھے اپنے چچا یاد آ جاتے ہیں۔" یہ قدرتی بات بھی ہے اور بہت لطیف جذبہ، احساس اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت لیکن انہوں نے جو کلمہ پڑھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیا، ایسی روحانیت پیدا کر دی اور ایسی ایمانی طاقت پیدا کر دی جس پر آج بڑے بڑے اولیاء اللہ رشک کر رہے ہیں۔ یہی وحشی ہیں جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ میں جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کی بھی نگاہِ انتخاب کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے ایک ہستی سے اسلام اور مسلمانوں کو محروم کیا تھا جو اسلام کے لیے تقویت کا باعث تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھی تو اس کی تلافی اور کفارہ کے لیے انہوں نے ایسی ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مبغوض تھی۔ ایک وہ شخص تھا جو نبوت کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا۔ پھر ایک وہ شخص تھا جو اس نبوت کے مقابلہ میں سینہ تان کر آیا تھا اور منصبِ نبوت کا گویا حریف اور رقیب تھا۔ انہوں نے گناہ کے کفارہ کے لیے جو بہترین انتخاب ہوسکتا تھا انتخاب کیا۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ان سے خوش ہوئی ہوگی۔ یہ سب ان کی ایمانی قوت کا نتیجہ ہے۔ یہ فوری انقلاب کی چند مثالیں ہیں۔ باقی صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین کے اندر جو تبدیلی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوئی اس سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے۔ اخلاقی پستی سے، اعمال کی پستی سے، عقائد کی تاریکی سے اور جاہلیت سے روحانیت اور ایمان و اخلاق اور تربیت و علم کے بلند مقام تک پہنچ گئے۔

تعلیم کتاب:

تیسرا شعبہ کتاب وحکمت، یعنی کتاب کی تعلیم دینا ہے۔ پہلے قاری تلاوت کرتا ہے۔ پھر اس کے تزکیہ کا عمل کرتا ہے۔ اس میں قرآن مجید کی تفسیر، اس کے حقائق کا بیان، اس کے علوم کا اظہار اور مقاصد قرآن کی تشریح وتفصیل سب شامل ہے۔ یہ ہے: "یُعَلِّمُهُمُ الکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ". (ان کو سکھاتے ہیں کتاب اور حکمت) پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں، اس کے حاملین اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے: "من یرد اللّٰہ به خیرا یفقهه فی الدّین". (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔)

یہ درحقیقت حامل قرآن کے فرائض چہارگانہ اور حامل قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے کمالات اور اس کی سیرت ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین جو علماء تھے اور جن کے علم کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف کی اور جن حضرات کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے فرمائے، امت کو ان کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا۔ مثلاً حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیت بیان کی ہے کہ قرآن مجید سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے۔ قرآن مجید کا بہت بڑا علم رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قرآن مجید پڑھنے کی تعریف آپ نے خود فرمائی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: "اللّٰهم علمه الکتاب وفقهه فی الدّین". (اے اللہ! ان کو کتاب کا علم عطا فرما اور دین کی سمجھ دے)

یہ حضرات بھی ان چاروں صفات کے جامع تھے۔ یعنی قرآن مجید کے قاری بھی

تھے اور معلم الکتاب بھی تھے اور معلم حکمت بھی اور مزکّی بھی تھے۔ یہ چاروں شعبے ان حضرات میں جمع تھے۔ پھر تابعین کا دور آیا۔ اس دور میں بھی کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان چاروں چیزوں کے جامع تھے مثال کے طور پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا نام لے سکتا ہوں کہ وہ ان چاروں شعبوں کے جامع تھے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر اور محمد بن سیرین اور حضرت سعید بن مسیّب۔ یہ وہ فضلائے تابعین تھے جو ان چاروں کمالات کے مظہر اور ان چاروں شعبوں کے جامع تھے۔ تبع تابعین میں بھی اسی طرح کی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئیں جو ان چاروں چیزوں کی جامع تھیں۔ جیسے ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء اور صوفیا۔ تابعین جیسی حضرت فضیل بن عیاض، حضرت معروف کرخی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اسی طرح سے جنید بغدادی رحمہ اللہ، یہ سب حضرات ان چاروں چیزوں کے جامع تھے۔ پھر انحطاط کا دوسرا دور شروع ہوا اور شعبوں کی تقسیم ہونے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں مختلف گروہ بن گئے اور ایک ایک شعبہ سنبھال لیا۔ بعض نے تلاوتِ آیات کو اپنا شعار بنالیا۔ انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تجوید اور مخارج کی تصحیح کی اور اتقان کے ساتھ پڑھنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے کہ بہت بڑا فرض کفایہ ادا کیا اور قرآن مجید کے لطف اور طریقۂ ادا کو محفوظ کر دیا جس طرح اس کے حروف کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی نقلیں کرا کے عالمِ اسلام میں بھیجی تھیں۔

بعض حضرات نے تعلیم کتاب وحکمت کو اپنا شعار بنایا۔ وہ علماء ظاہر کی جماعت ہے جنہوں نے قرآن وحدیث کے رموز کو بیان کیا۔ ان کے مضامین کی اشاعت کی اور ان کے مشکلات کی تشریح کی۔

تربیت وتزکیہ:

بعض حضرات نے تزکیہ اپنے ذمہ لیا۔ وہ حضرات صوفیاء کرام ہیں جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جولوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے نفوس کی اصلاح و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب واخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنادیا۔ ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ۔

تجدید سلوک:

پھر ان کے بعد جنہوں نے فن سلوک کا کام کیا۔ اپنے زمانہ کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبیعتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید کی۔ ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا اور اپنے زمانہ کے مطابق ان کو بنایا اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔

حاملِ قرآن کی ذمہ داریاں:

اصل میں حامل قرآن کا کام صرف تلاوت، اس کو پڑھ کر سنا دینا، صحیح طور پر یاد کر لینا، اور اس کو صحت کے ساتھ ادا کر دینا اور کسی مجلس میں، کسی جلسہ میں قرآن مجید پڑھ دینا نہیں ہے، بلکہ حامل قرآن کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
"اس شخص کو عذاب دیا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا علم دیا، وہ رات کو سویا اور

سوتا رہا، یہاں تک کہ صبح کی نماز قضا ہوگئی۔"

قرآن مجید کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے اس کو یاد کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی۔ اس پر عمل کرنے کی، یہی وجہ تھی کہ جب جنگ یمامہ پیش آئی جو اسلام کی شدید ترین جنگوں میں ایک جنگ ہے جس میں زور کا رن پڑا۔ اور زور کی لڑائی ہوئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے بس ایک موت کا بازار گرم تھا اور کسی طرح فیصلہ نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے للکارا اور کہا اے حاملین قرآن! اور وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن ہے آج قرآن پر عمل کر کے دکھاؤ! اور قرآن پر قربان ہو جاؤ! اس لیے کہ اگر یہ ارتداد کا فتنہ نہ ختم ہوا تو قرآن مجید کا باقی رہنا مشکل ہے۔ چنانچہ جو حفاظ تھے وہ آگے بڑھے اور فیصلہ کرلیا۔ بے جگری کے ساتھ لڑے اور پروانوں کی طرح نثار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ﴾ (قرآن مجید بڑی عزت والے صحیفوں میں سے ہے، اونچے اور پاک کیے ہوئے ایسے سفیروں کے ہاتھوں میں جو بڑے شریف اور پاکباز ہیں۔)

معلوم ہوا کہ حاملین قرآن کی یہ تصویر کرام بررة ہونا چاہیے۔ حاملین قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کی صفت ہے، بلکہ معلوم ہوا کہ جو قرآن مجید کو اُٹھانے اور سینے میں رکھنے کا حوصلہ کرے اس کو ایسا بننا چاہیے۔

﴿لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اس قرآن مجید کو مطہر ہی چھوئیں۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین سے جو لوگ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے اور جن میں قرآن مجید کا علم خاص ہوتا تھا، وہ ممتاز اور اپنے اخلاق وتقویٰ اور عبادت میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب میدان احد میں شہدا کی لاشوں کو دفن کرنے لگے تو قرآن مجید جس کو زیادہ یاد ہوتا اس کو پہلی صف میں

رکھتے جاتے تھے۔اور فرمایا کرتے تھے:"يؤمكم من هو أقرأكم". (امامت وہ کرے جوزیادہ پڑھا ہوا ہو۔)

تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خالی حافظ ہو جس کو قرآن مجید کا علم زیادہ ہو، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفاظ کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

عبرت آموز واقعہ:

دیکھیے جس شخص کو کوئی بڑی چیز ملتی ہے وہ چھوٹی چیزوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ پھر چھوٹی چیزوں کی طرف اس کی نگاہ نہیں جاتی۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں ایک قصہ سنایا۔ وہ قصہ آپ کو بھی سناتا ہوں۔ بڑا عبرتناک قصہ ہے۔ بڑے کام کی بات ہے:

"ایک شخص نے کہیں سفر پر جاتے ہوئے شہر کے کسی معزز آدمی کے یہاں اپنی امانت رکھوادی۔ اچھی خاصی رقم تھی کئی ہزار روپیہ کی اور کہا میں سفر پر جارہا ہوں، وہاں سے آکر لے لوں گا۔ انہوں نے کہا اچھا رکھ دو، اللہ مالک ہے، آنا تو پھر لے لینا۔ وہ بے چارہ سفر کر کے آیا عرصہ کے بعد اس نے ان سے جا کر کہا کہ ہماری امانت دے دیجیے تو وہ بالکل انجان بن گئے۔ کہنے لگے کہ میں تم کو پہچانتا نہیں کہ تم کون ہو اور کب آئے تھے اور کب رکھوایا تھا؟ بے چارہ حیران ہو گیا۔ شریف سمجھ کر نہ اس سے کوئی لکھا پڑھی کی تھی نہ دستاویز لکھوائی تھی۔ اب وہ جتنا یاد دلاتا وہ بھولتے جاتے، یہاں تک کہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ ایک شریف آدمی کو بدنام کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی، تم مجھے چور بناتے ہو۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے جا کر قاضی سے شکایت کی۔ قاضی صاحب بہت ہی سمجھدار اور ماہر نفسیات تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا علاج میں کروں گا۔ تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک شخص کو بھیجا اور کہلوایا کہ آپ قاضی بننے والے ہیں، وہ سن کر بہت خوش ہوئے، بڑا اعزاز تھا۔ چند دن کے بعد اس شخص سے کہا کہ جا کر اپنی امانت مانگو۔ وہ گیا اور اس نے کہا کہ شاید

آپ کو یاد آ جائے کہ میں فلاں وقت آیا تھا۔ کہا: ہاں! مجھے یاد آ گیا اور تمہارے جانے کے بعد ہی مجھے یاد آ گیا تھا اور میں تمہارا منتظر تھا۔ تمہارے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا، بہت اچھا کیا کہ تم آ گئے۔ تمہاری امانت وہاں رکھی ہوئی ہے جا کر لے لو۔ جیسے تم رکھ کر گئے تھے ویسے ہی رکھی ہوئی ہے۔ وہ گیا اور لے آیا۔ اس کو بڑا تعجب ہوا اور ان دو باتوں میں تعلق سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے قاضی سے کہا جو قاضی القضاۃ تھے۔ خیر میری امانت مجھے مل گئی، مگر یہ انتظام آپ نے کیسے کیا؟ اور انہوں نے اقرار کیسے کیا اور وہ انکار کے بعد اقرار؟ قاضی صاحب نے کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ ان کو اس سے بڑی چیز ملنے والی تھی۔

اصل میں اس اعلیٰ چیز سے اس گراوٹ کا کوئی جوڑ نہ تھا جس کو قضا مل رہی ہو یا وزارت مل رہی ہو تو وہ کسی کے پانچ سو یا دو سو روپے کیا مارے گا۔ اب ان کے ذہن کی سطح ایک دم سے بلند ہوگئی تو وہ سوچنے لگے کہ میں قاضی ہوں۔ اب قاضی کی حیثیت سے معاملہ کو سوچنے لگے تو یہ حرکت ان کو بہت گری ہوئی معلوم ہونے لگی اور انہوں نے سوچا کہ پانچ سو کی کیا حقیقت ہے؟

تو میں نے اپنے طلبہ سے کہا کہ تم یہ سمجھو کہ تم عالم ہونے والے ہو۔ اس وقت یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تم کو اتنی گری ہوئی معلوم ہوں گی کہ تمہیں ان کے تصور کرنے سے تکلیف ہوگی کہ ہم عالم ہو کر ایسی بات کر سکتے ہیں؟ ہمارے سینے میں جو اللہ کا کلام، حدیث ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے تو ہم ایسی اوچھی اور گری ہوئی بازار باتیں کر سکتے ہیں۔

قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے:

یہی میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے تو پھر آپ میں جو کم درجہ کی باتیں ہیں۔ کوئی بھی گناہ، کوئی بھی گراوٹ کی بات، کوئی بھی سوقیانہ اور اوچھی حرکت، جیسے مال کی محبت، عہدہ کی محبت اور تراویح کا تھوڑا تھوڑا معاوضہ لینا یہ ساری چیزیں آپ کی نظر سے ایسی گر جائیں کہ اگر آپ اپنی حیثیت پہچان

پس جس طرح سے وہ شخص جس نے صاف کہہ دیا کہ میں تمہیں نہیں جانتا کہ تم نے کب امانت رکھوائی؟ پھر اقرار کرلیا کہ ہاں ہاں! تم نے امانت رکھوائی تھی اور پھر دے دی۔ اسی طرح سے آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو پھر کبھی کسی گناہ کی طرف کبھی کسی ادنیٰ کام کی طرف کبھی کسی پست خیالی کی طرف آپ کا ذہن نہیں جاسکتا۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے سینہ میں کیا ہے ع

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج

در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

شاعر نے تو چاند کو خطاب کر کے کہا کہ ہلال جب باریک ہوتا ہے تو بے چارہ حقیر معلوم ہوتا ہے۔ تب اپنے اوپر، اپنے مستقبل پر نظر ڈال لو، اپنی تہی دامنی پر رنج نہ کرو کہ تو خالی ہے بالکل بال کی طرح ع

درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

تیرے سینہ میں چودھویں کا چاند سو رہا ہے اور چودھویں کے چاند کی کیا حقیقت ہے؟ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے، سرّ الٰہی ہے، علم الٰہی ہے، علمِ اعظم ہے، لوگ اسم اعظم کے پیچھے پڑتے ہیں، آپ کے سینہ میں علم اعظم ہے اسی علم اعظم میں اسم اعظم بھی ہے۔ آپ تو حاملِ عملِ اعظم، حاملِ اسمِ اعظم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی فضیلت میں فرمایا۔ ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں ملیں گی اور میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "خیر کم من تعلم القرآن و علّمہٗ." دیکھ لیجیے قرآن مجید کے کیسے کیسے فضائل ہیں۔ اگر حافظ تیس پارے پڑھے اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینہ میں پڑھے اور مسجد میں رمضان کی راتوں میں پڑھے اور اس کے بعد سو دو سو پانچ سو روپیہ معاوضہ لے۔ حیرت

کی بات یہ ہے کہ کیسے ایک انسان اس پر تیار ہوسکتا ہے!؟

ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ایک روز بہت جوش میں آ کر کہنے لگے۔خدا کی قسم! اگر کوئی پورا ایک ملک پیش کرے اور کہے کہ پوری سلطنت لے لو اور ایک مرتبہ اللہ کہنے کا ثواب مجھے دے دو، اللہ میں راضی نہ ہوں گا۔اور قرآن تو اللہ کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے اور اس عالم میں سب سے بڑی قیمتی چیز جس کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے وہ قرآن مجید ہے اور جو سب سے بڑی دولت اس آسمان کے نیچے ہے، وہ قرآن مجید ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کی نسبت ہے، اللہ کا کلام ہے اس سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے اپنی قدر خود کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے۔اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو آپ کے قدم زمیں پر نہ پڑیں۔کسی امیر کی کسی دولت کی وقعت آپ کے دل میں نہیں ہوسکتی۔اگر ہوتی تو ہزار بار استغفار کرتے۔ارے میرے دل میں، میرے سینہ میں اللہ کا پورا کلام ہے اور میں اس تاجر کو اس وزیر کو معزز سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میرے دشمن میرا کیا بگاڑیں گے؟ میری جنت تو میرے سینہ میں ہے، وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے میں تو اپنی جنت لیے پھر رہا ہوں۔اللہ کا کلام، اللہ کا علم میرے سینہ میں ہے، میرا باغ تو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے کیا قید کریں گے۔میں تو بالکل آزاد ہوں، جہاں بھی رہوں گا، آزاد رہوں گا۔

روحانیت پیدا کرنے کیلئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے:

کیوں ایک شخص کے اندر اتنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اتنی ترقی کرتا ہے اور ایک شخص وہ ترقی نہیں کرتا، فرق صرف عظمت اور اکتساب کا ہے۔کلام اپنی جگہ عظیم ہے، لیکن اس کی عظمت کا استحضار بھی ضروری ہے۔شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مثالوں کے بادشاہ تھے۔عجیب عجیب مثالیں دیتے تھے۔وہ اس کی مثال دینے لگے۔کہنے لگے کہ کسی چیز کا ہونا

اور چیز ہے۔ اور اس کا علم حضوری اور چیز ہے۔ نواب محبوب علی خاں جو شاہ دکن تھے۔ موجودہ نظام کے والد، ان کی یہ عادت تھی کہ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے تو ایک دن یونہی بھیس بدل کر شہر میں گشت کر رہے تھے۔ ایک تانگہ میں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ دوسرے صاحب بھی تانگہ میں بیٹھے چلے جا رہے تھے۔ دونوں بات کرنے لگے۔ کہو بھائی! آج کل کیا خبر ہے۔ دوسرے صاحب یہ جان نہ سکے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج کل گلی کوچہ میں محبوب علی خاں جو ہمارے نواب ہیں کے منہ پر ہر شخص تھوک رہا ہے اور ان کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے اور ایک قصہ جو اس زمانہ میں مشہور ہوا تھا وہ ذکر کر کے اس نے کہا کہ آج کل یہ مشہور ہو رہا ہے کہ وہ یہ کر رہے ہیں اور جو منہ میں آیا کہنا شروع کیا۔ محبوب علی خاں وہیں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے بیڑی نکالی اور کہا: دِیا سلائی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں ہے۔ رات کا اندھیرا تھا، اس نے جو ماچس جلائی تو پہچان لیا کہ یہی محبوب علی ہیں۔ بس اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رعشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں۔

بزرگان دین چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ محبوب علی خاں تو وہی تھے جو آ کر بیٹھے۔ اس وقت محبوب علی خاں صاحب تھے جب پوچھا تب بھی محبوب علی خاں تھے۔ جب اس نے کہا تب بھی محبوب علی خاں تھے اور اس وقت جب ماچس جلائی اور منہ دیکھا تو محبوب علی خاں بدل گئے تو اس پر ہیبت کیوں طاری ہوئی۔ وجود پہلے سے تھا علم اب حاصل ہوا۔ حالت ہی بدل گئی، تو وجود قرآن تو وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا۔ جو آپ نے بچپن میں پڑھا۔ آپ نے جوانی میں پڑھا۔ جو آپ بڑھاپے میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے جو آپ تہجد میں پڑھتے ہیں، جو آپ تلاوت کرتے ہیں، وہی قرآن مجید ہے، اس میں ایک نقطہ کا اضافہ نہیں، لیکن جو آپ کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کس اللہ کا کلام جس کی صفت یہ ہے اور کون

سا کلام جس کی یہ شان ہے۔اب آپ کی کیفیت، اور کیفیت ہوگئی۔

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

(اگر ہم اس قرآن مجید کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا، پھٹ جاتا۔ اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے، ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی، اس سے ان لوگوں کی جلد جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، کانپ اُٹھتی ہے پھران کی جلد اوران کے قلب اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں۔)

تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں پیدا کرنی ہیں۔ ایک کلام اور صاحب کلام کی عظمت دوسرے ثواب کی نیت اورثواب کا یقین کہ ثواب مل رہا ہے بس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص اعلیٰ مقام ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔

قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن مجید ہے:

بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ سلوک کا آخری درجہ قرآن ہے اور نوافل میں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب سالک تمام مقامات طے کر لیتا ہے جو ذکر سے طے ہوتے ہیں، اس کے بعد جو آخری درجہ ہے قربِ الٰہی کا وہ کلام الٰہی کی کثرت تلاوت سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے ہیں کہ جو قرب قرأت قرآن کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس قرب کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اور یہ قرب استحضار سے، عظمت سے اور ثواب کے یقین سے حاصل ہوتا ہے۔ پڑھتے جایئے اور یقین کرتے جایئے کہ ثواب مل رہا ہے۔ ہر حرف پر دس نیکیاں مل رہی ہیں۔ اس کا شوق آپ کے دل میں زیادہ ہونا چاہیے، جتنا زیادہ پڑھیں گے اتنی زیادہ نیکیاں ملیں گی۔ بس بھائیو!

اگر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں تو قرآن مجید کی تلاوت میں روح پیدا ہو جائے۔

قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے:

اور اگر اس کو پیشہ بنائیں تو اس سے بہت اچھا ہے کہ دنیا کو آدمی ذریعہ بنائے کسبِ معاش کا، قیامت کے دن وہ لوگ جو حلال روزی حاصل کرتے تھے اور جائز طریقوں سے کاروبار کرتے تھے، ان دنیا دار قاریوں، حافظوں اور عالموں سے بدرجہا آگے ہوں گے جنہوں نے دین کو ذریعہ بنالیا تھا اپنا پیٹ بھرنے کا اور دنیا کمانے کا، تاجروں میں بکثرت اولیاء اللہ نکلیں گے جو سمجھتے تھے ہم دنیادار ہیں۔صرف بچوں کے پالنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے ایک دھندہ کیا ہے اور اس میں ذکر کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، ڈرتے رہتے تھے، استغفار کرتے رہتے تھے، وہ کئی عالموں اور حافظوں سے بڑھ کر نکلیں گے جنہوں نے قرآن مجید اور علم حدیث کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے صحبت اور محنت ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو یہ دولت عطا فرمائی ہے تو اس میں روح بھی، خشیت بھی اور تقویٰ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور یہ بات بغیر صحبت کے اور بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی۔قرآن مجید کے یاد کرنے میں آپ نے جتنی محنت کی ہے اب اس یاد میں جان ڈالنے اور موزونیت پیدا کرنے کے لیے بھی آپ کو محنت کرنی چاہیے۔اگر آپ نے قرآن مجید کے یاد کرنے میں دو برس لگائے تو سچی بات یہ ہے کہ اس میں چار برس لگائیے، اس لیے کہ وہ تو الفاظ ہیں جس کو کافر و مؤمن سب پڑھ سکتے ہیں اور بے شک کافر کو یاد ہونا مشکل ہے، لیکن یاد ہوتا ہے۔اب بھی مصر و شام میں کتنے غیر مسلم ایسے ہیں جن کو قرآن مجید یاد ہے۔المنجد کا مصنف جو عیسائی تھا وہ حافظ تھا۔تو معانی قرآن، علوم قرآن اور قرآن مجید کو دل میں راسخ کرنے کے لیے، اپنے اخلاق کو صحیح کرنے کے لیے آپ کو وقت لگانے اور

محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا جارہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سفر میں قرآن مجید میں جو بات حاصل ہوتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے وہ گھر پر نہیں آتی۔ تو حضرت بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو مخاطب کیا کہ دیکھو! مولانا کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی سچی بات ہے۔ میدانِ جہاد میں جن لوگوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور خدمت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور محنت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا ان کی سمجھ تو ہمارے یہاں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو قرآن مجید کی تعظیم کرنے کی، اس پر عمل کرنے کی اور اس کا لطف لینے کی اور اس سے قرب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وما علینا إلا البلاغ المبین!!!.

ایک اہم خطاب

از

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

تقریر ۱۹۴۷ء میں بمقام جامع مسجد دہلی
مسلمانوں کے ایک عام مجمع میں یہ کی گئی تھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل ونہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد۔

چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اُٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہیں خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو! تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا۔ وہاں میرے بال و پر کاٹ دیے گئے ہیں یا میرے آشیانہ کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی! تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی تازگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو! یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی اَن سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتاری تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمتی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ وہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اُٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا تھا۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے، یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل

آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کی پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس کی جگہ بری شے آ گئی ہے۔ ہاں تمہاری بے قراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے کو ماویٰ و ملجا سمجھ رکھا تھا میری مراد غریبی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو، آخر تمہاری عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پُر خار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہیں، لیکن آج جو کچھ کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

متحد ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ پچھلے سات برسوں کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آ رہا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے، لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اب یہ ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں، اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں تم کو ہمارے علاوہ کوئی زیر نہیں کرسکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو! شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کردو۔ یہ تین دھارے کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو! اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو! اور پھر دیکھو کہ یہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو؟

یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کردیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ سرزمین دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا۔ اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلاسکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈراسکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہوجانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو! تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی

رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ۔ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا:

"جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"۔

ہوائیں آتی ہیں گذر جاتی ہیں، صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں، لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے، جو ہونا تھا۔ وہ ہو کر رہا، سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، تو پھر حالت دوسری ہے، لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ تو پھر اس طرح بدلو! جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار ہو جائیں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ! ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر

نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ! عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے، تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اُٹھی تو اس کا رُخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا ہے۔ وہ نسخہ ہے، قرآن کا یہ اعلان کہ ﴿لا تهنوا و لا تحزنوا، وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين.﴾

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

ضرورت

و

اہمیت علم

مبلغ اسلام حضرت مولانا طارق جمیل صاحب مدظلہ العالی

بمقام: جامعہ اسلامیہ اسلام آباد

بتاریخ: ۱۵/۸/۲۰۰۲ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى، وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمَآءَ بِقُدْرَتِهٖ، وَدَحَى الْاَرْضَ بِمَشِيَّتِهٖ، وَخَلَقَ الْخَلَائِقَ بِاِرَادَتِهٖ، وَاسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ بِقُوَّتِهٖ، لَيْسَ لَهٗ بَدِيْلٌ وَلَا مَثِيْلٌ وَلَا شَرِيْكٌ وَلَا مُشَارِكٌ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ!

اَمَّا بَعْدُ: فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

وَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم إِنَّكُمْ فِىْ زَمَانِ هُدْنَةٍ وَإِنَّ السَّيْرَبِكُمْ لَسَرِيْعٌ أَفَلَا تَرَوْنَ إِلَى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ يُبْلِيَانِ كُلَّ جَدِيْدٍ، وَيُقَرِّبَانِ كُلَّ بَعِيْدٍ، وَيَأْتِيَانِ بِكُلِّ مَوْعُوْدٍ! قَالُوْا مَاالْهُدْنَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: دَارُ بَلَاءٍ وَانْقِطَاعٍ فَإِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْاُمُوْرُ كَقِطَعِ الَّيْلِ الْمُظْلِمِ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْاٰنِ؛ فَإِنَّهٗ مَاحِلٌ مُصَدِّقٌ وَشَافِعٌ مُشَفَّعٌ. مَنْ جَعَلَهٗ أَمَامَهٗ سَاقَهٗ إِلَى الْجَنَّةِ وَمَنْ جَعَلَهٗ خَلْفَهٗ سَاقَهٗ إِلَى النَّارِ." أَوْ كَمَا قَالَ صَلَّى اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

اہمیتِ علم:

میرے محترم بھائیو اور دوستو!

علم تو بنیاد ہے۔ علم تو شعبہ کوئی نہیں۔ یہ عزیز بیان کر رہے تھے تو میں دو نفل پڑھ رہا تھا۔ میرے نزدیک تو علم شعبہ نہیں ہے۔ علم جڑ ہے جس سے آگے شعبے پھوٹتے ہیں۔ سب پر حاوی ہے۔ علم نہ ہو تو کوئی: مدرسہ کہاں سے چلائے گا؟... خانقاہ کہاں سے چلائے گا؟...

تبلیغ کہاں سے کرے گا؟ ... جہاد کہاں سے کرے گا؟ ... وعظ کیسے کرے گا؟... تصنیف وتالیف کیسے کرے گا؟

یہ تو ایسے دینی شعبے کہلاتے ہیں پھر آ گے:

معاشرت میں کیسے چلے گا؟.... معاملات میں کیسے چلے گا؟... تجارت میں کیسے چلے گا؟... زراعت میں کیسے چلے گا؟... حکومت میں کیسے چلے گا؟... لین دین میں کیسے چلے گا؟... باپ بیٹے کا تعلق ... میاں بیوی کا تعلق ... بھائی بھائی کا تعلق ... بہن بہن کا تعلق ... پڑوس کا ...عزیز واقارب کا ، ... زندگی کا کونسا شعبہ ہے جہاں انسان کو علم کی ضرورت نہ ہو، تو جو چیز تمام شعبوں کی ضرورت بن جائے تو وہ شعبہ نہیں ہوتا وہ تو کُل ہوتا ہے۔ یہ ایسی مقدس چیز ہے کہ کتا بھی اگر علم سیکھ لے تو اس کا مارا پاک ہو جاتا ہے۔

کیا ہے وہ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ۔ یہ ایسی مقدس چیز ہے کہ اگر کتے کو بھی آپ سکھا دیں ناں تو اس کا شکار سیکھے ہوئے ، پڑھے لکھے کتے کا شکار حلال اور آوارہ کتا کچھ بھی نہ اس کو کہے تو اس کا پکڑا ہوا حرام ۔ دانت لگ گیا حرام۔ شکاری سیکھے ہوئے کتے کا دانت بھی لگ جائے تو ناپاک ہو گیا ناں؟ حلال ہے، کیوں؟ علم ہے۔

تو علم تو وہ چیز ہے جو کتے کو بھی پاک کر دیتی ہے۔ یہ تو انسان ہیں۔ بنی آدم ہیں۔ فرشتوں سے بھی اعلیٰ وارفع ہیں۔

اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ۔ ان کو جو نیچا کہا گیا تو کس بات پر کہا گیا۔

اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

انہوں نے کہا: ہمیں تو کچھ بھی نہیں آتا یا اللہ!

کہا: پھر ایسے ہی دخل در معقول کر رہے۔

ان کو جو خاموش کروایا، تو اُن سے ان کی جہالت کا اعتراف کروایا۔

تائیدِ باری تعالیٰ:

تو پہلی جو وحی آئی تو جبرئیل اور اللہ تعالیٰ کی بات ایک ہی تھی۔ اِقْرَءْ۔ انہوں نے کہا: مَاۤاَنَا بِقَارِئٍ۔ انسان اپنی اصل میں تو پڑھا ہوا ہوتا نہیں۔

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا. پھر جبرئیل بولے: اِقْرَءْ مَاۤاَنَا بِقَارِئٍ!

پھر سینے سے لگایا، بھینچا ... پھر سینے سے لگایا، بھینچا ... پھر کہا: اِقْرَءْ ... مَاۤاَنَا بِقَارِئٍ! پھر زور سے سینے سے لگایا۔ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّیْ الْجَھْدُ ۔ پھر کہا: اِقْرَءْ۔ تو آگے جب عبارت سامنے آئی تو اس میں بھی تھا: اِقْـرَءْ۔ تو یہ چوتھی دفعہ آ گیا۔ تین دفعہ جبریل بولے۔ چوتھی دفعہ اللہ بولے: اِقْرَءْ۔ پہلا کام ہی پڑھنے سے بتایا گیا: بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. معلوم ہوا کہ اللہ کی تائید کے بغیر جو پڑھنا ہوگا وہ ایسے ہی یَحْمِلُ أَسْفَارًا ہوگا۔ اگر اللہ پاک کی تائید اور اللہ پاک کی طرف سے رُشد و ہدایت اور اللہ کی طرف سے فیضان نہیں ہے تو یہ یَحْمِلُ أَسْفَارًا ہوگا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ.

برکتی مولوی:

پھر کہا: اِقْرَءْ۔ اس سے میں نے یہ استنباط کیا ہے کہ ہر کتاب کو کم از کم پانچ دفعہ پڑھے تو تب جا کے اسے علم کی کچھ شد بدھ ہوگی۔ جو دن میں پانچ سبق پڑھے وہ تو برکتی مولوی بنے گا۔ جو دن میں پانچ سبق پڑھے۔ اب تو چھ بھی پڑھیں۔ آگے جا کے سات بھی پڑھیں۔ چودہ بھی سنا رہے ہیں۔ تو یہ تو "خواندہ ناخواندہ برابر شد" ہو جائے گا۔

جو صاحب ہدایہ کے استاد ہیں انہوں نے کتاب لکھی ہے "آداب التعلم" تو اس میں وہ ایک جملہ لائے ہیں: تَعَلَّمْ حَرْفاً وَ کَرِّرْ اَلْفًا اور ہم کیا کرتے ہیں: تَعَلَّمْ اَلْفًا اور تکرار کی ویسے ہی چھٹی۔ تو بھائی ان کو کیا آئے گا۔

خیر! یہ میرا ایک استنباط ہے۔ لیکن میں نے خود اپنے اوپر اس کا التزام کیا۔ آٹھ، آٹھ دفعہ ایک کتاب میں نے پڑھی۔ حفظ کیا متون کو۔ زبانی یاد کیا۔

آگے کیا کہا: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ تو اگر قلم کا استعمال نہیں تو پھر بھی برکتی مولوی صاحب ہے، ایک ہے یہ تقریر لکھنا، اس کو میں قلم کا استعمال نہیں کہتا ہوں جو اَلْکَلِمَۃُ پہ فضولیات چل رہی ہے، اس کو لکھنا یہ کوئی علم نہیں ہے۔

وہ بیچارہ ابن حاجب کیا قصور کر بیٹھا کہ اُس کے اختصار کو جوں کھینچا، جوں کھینچا۔ دیکھو! جو ہوتا ہے ناں عجمی۔ ان کی طبیعت میں طوالت ہے، اختصار نہیں۔ ہماری طبیعت عجم کی طبیعت میں بسط ہے اور عرب کی طبیعت میں اختصار ہے اور علم اتنی لمبی چوڑی مباحث کا نام نہیں ہے۔

اجمال و تفصیل:

میں اور ایک عرب گاڑی میں جا رہے۔ تو بات چل رہی تھی کہ بھائی جو پہل کرتا ہے فضیلت اس کی ہوتی ہے۔ قطر میں ہم تھے تو ہمارے ایک پرانے ساتھی کچھ کمزور ہو گئے تھے۔ تو کچھ دوست اُن پر تنقید کر رہے تھے۔ بھائی یہ آتے تھے، جڑتے نہیں تو اس پر ہم آپس میں بات کرتے جا رہے تھے۔ سابقیت ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ تو اس پر میں نے ڈاکٹر فوزی تھے ہمارے۔ وہ بڑے ادیب بھی ہیں۔ شاعر بھی ہیں تو میں نے بطور دلیل ان سے کہا، میں نے کہا: دیکھو وہ شاعر بھی کہتا ہے ؎

وَمِمَّا شَجَانِیْ اَنَّنِیْ کُنْتُ — وَعَلَّلَ مِنْ بَرْدٍ بِطِیْبِ التَّبَسُّمِ
اِلٰی اَنْ دَعَتْ وَرَقَ مِنْ غُصْنٍ اَیْکَۃٍ — تَفَرَّدَ مَبْکَاھَا بِحُسْنِ التَّرَنُّمِ
فَلَوْ قَبْلَ مَبْکَاھَا بَکَیْتُ صَبَا بَۃً — بِسُعْدَی شَفَیْتُ النَّفْسَ قَبْلَ التَّنَدُّمِ
وَلٰکِنْ بَکَتْ قَبْلِیْ فَھَیَّجَ لِیَ الْبُکَاءَ — بُکَاھَا فَقُلْتُ الْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ

یہ میں نے آپ کو پورا قصیدہ سنا دیا مقامات میں آخری دو شعر ہیں۔

تو وہ مجھ سے کہنے لگا تم جو عجم ہو ناں تمہاری طبیعت میں تفصیل ہے۔ ہم عرب ہیں ہماری طبیعت میں اجمال ہے۔ یہی مفہوم جو تم نے کہا ہے، دو شعر میں ہے۔

کہا: ابونواس کہتا ہے ؎

نَقِّلْ فُؤَادَكَ حَيْثُ شِئْتَ مِنَ الْهَوٰى   مَا الْحُبُّ اِلَّا لِلْحَبِيْبِ الْاَوَّلِ

كَمْ مَنْزِلٍ فِى الْاَرْضِ يَأْلَفُهُ الْفَتٰى   وَحَنِيْنُهٗ اَبَدًا لِاَوَّلِ مَنْزِلِ

کہا: یہ وہی مضمون ہے جو تم نے چھ میں کیا، میں نے تمہیں دو میں بیان کر دیا۔ تو خیر یہ تو بیچ میں جملہ معترضہ آ گیا۔

علمی استعداد کیسے پیدا ہوگی؟

یہ الکلمہ کو لکھنا لکھانا یہ کوئی علم نہیں ہے۔ لکھنے سے مراد میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ کتاب پڑھیں، مطالعہ کریں۔ ایک دفعہ کریں، دو دفعہ کریں، دس دفعہ کریں پھر اس سے جو آپ سمجھیں اس کو آپ خود لکھیں۔ اپنی تعبیر لکھنا، کتاب سے اخذ کر کے یہ قلم ہے قلم۔ اصل جس سے استعداد بنے گی۔ استاد کی ضروری چیزوں کو لکھنا بھی ہے۔ وہ بھی ہے۔

مولانا کا علمی شغل:

میں جب دورے میں تھا تو ساری کتابیں خریدیں۔ ساری تو جتنی ضروری چیزیں تھیں سب حاشیے پر لکھیں۔ سب آج بھی وہ اسی طرح لکھی پڑھی ہیں۔ ہمارے تو نصیب نہ ہوا پڑھانے کے، تبلیغ نے پہیہ بنا دیا لیکن اس میں اتنا کچھ میں نے لکھا ہوا ہے کہ کوئی بھی اس کتاب کو لے کر بیٹھ جائے یہ جو غیر ضروری چیزیں ہیں آج جو ہمارے درس کا حصہ بن گئی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو پورا اس میں سبق تیار ہے۔ بے شک کتاب کھول کر پڑھائے۔ ہمارے استاد صاحب فرمایا کرتے تھے یہ جو میں نے تمہیں لکھا دیا ہے جب کبھی کتاب کھول کے تمہیں اگر پڑھانے کا موقع ملے تو یہی کافی ہے۔

حفاظتِ خداوندی:

علم تو میرے دوستو! ایسی چیز ہے جو کتے کو بھی پاک کر دیتا ہے۔ یعنی اس کا شکار۔ تو ہم تو انسان ہیں۔ انسانوں کو راہبری کے لیے، دنیا اور آخرت کے مسائل کے حل کرنے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دولت ہمیں عطا فرمائی ہے اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اس نے اس کو خود محفوظ کیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ ورنہ شاید ہم بھی ضایع کر بیٹھتے جیسے بنی اسرائیل نے ضایع کیا۔ جیسے یہود و نصاریٰ نے ضایع کیا۔ شاید ہم سے بھی ضایع ہو جاتا لیکن چونکہ اللہ خود نگران تھا لہٰذا وہ اپنی قدرت سے ایسے لوگ پیدا فرماتا رہا۔

مردوں میں، عورتوں میں، سابقین میں بھی اور مقتدمین میں، متاخرین میں۔ جو اس کو لے کر ہم تک حرف بحرف پہنچا چکے ہیں تو جب بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور جڑ مضبوط ہوتی ہے تو درخت اتنا ہی قوی ہو جاتا ہے۔ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ. تو علم کی جڑیں جتنی مضبوط ہوں گی اتنا اس سے جو شاخیں پھوٹیں گی وہ مضبوط ہوں گی۔

دُشمن کی نگاہ ہم پر کیوں ہے؟

ایک وہ مولوی صاحب فرما رہے تھے دشمن کی ہم پر نگاہ ہے جو درخت سوکھتا ہے ناں چور کی نگاہ اُسی پر ہوتی ہے۔ ہمارے دیہات کی بات ہے کہ اس کو کاٹ کے میں نے جلانا ہے، جو درخت پھلدار ہوتا ہے ناں چاہے ہم سوئے بھی ہوئے ہوں تو اس کے کوئی قریب نہیں آتا۔ ہمارا علاقہ باغات کا ہے، آم کے باغ ہیں، کینوں کے باغ جو سوکھ جاتے ہیں ناں وہ ہمارے سامنے ہی کاٹ لیتے ہیں۔ ہم بھی اعتراض نہیں کرتے، چلو ٹھیک ہے۔ ہے ہی جلنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی اس کا کام ہی نہیں لیکن جو پھلدار درخت ہے، ہم سوئے ہوئے ہوں۔ ہمارے ملازم سوئے ہوں، کوئی جرأت نہیں کرتا۔

ہاں کوئی پھل تو توڑ لے گا، کوئی آم چرا لے لیکن کوئی شاخ کاٹنے کی ہمت نہیں کرتا اور جو سوکھ جائیں تو مالک بھی مستغنی ہو جاتا ہے، چلو ٹھیک ہے! تو دشمن کی نگاہ پتہ ہے کب پڑتی ہے جب درخت سوکھنے لگ جاتا ہے، اس سے پہلے کسی کی ہمت نہیں کہ وہ آنکھ اُٹھائے۔

ہمیں تبلیغ والوں نے یہ سکھایا ہے کہ اپنے اندر سبب تلاش کرو پہلے۔ ممکن ہے اپنے اندر کوئی خلل آ چکا ہو۔ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ.

اس آیت میں جو قانون اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں وہ تو پہلے اپنوں میں غور کرنے کا ہے کہ اپنے اندر غور کرو کہ دشمن کی نظر اُٹھی کیوں ہے؟ وہ کلہاڑا لے کر آیا کیوں ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہیں شاخوں میں خشکی ہو چکی ہے، کہیں پتے جھڑ چکے ہیں، کہیں جڑ کھوکھلی ہو چکی ہے۔

ہمارے ایسے مکئی کی فصل کاشت تھی۔ تو ایک چور آیا چور نے بعد میں خود بتایا۔ جھولی بنائی، چھلیاں توڑنے کے لیے، نظر دوڑائی تو اٹھارہ ایکڑ کا ایک پلاٹ تھا، اٹھارہ ایکڑ کا۔ آخر تک جو اس کی نظر گئی تو ایک چھلی بھی نہیں ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک چھلی، اُس نے ڈر کر جھولی کھول دی کہ ضرور کوئی یہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے، جوں ہی میں نے چھلی توڑی میں پکڑا

جاؤں گا۔ایک آدمی نہیں بیٹھا تھا۔وہ ڈر کر چھوڑ گیا کہ اس کی تو ایک چھلی بھی نہیں ٹوٹی ہوئی معلوم ہوا اس کا مالک جاگتا ہے، تو پھر اس نے خود آ کر کہا کہ! جی کیا چکر ہے کہ ایک چھلی بھی نہیں ٹوٹی ہوئی تھی۔تو ہماری کئی چھلیاں ٹوٹی ہیں، جس سے انہوں نے کہا اور بھی توڑ لو۔

چہرے پہ پیلاہٹ موسم سے نہیں آتی ،اندر کی کمزوری سے آتی ہے۔

چہرے کا مرجھانا یہ گرم سرد موسم سے نہیں ہوتا یہ اندر کی کمزوریوں سے ہوتا ہے۔

علم کی روشنی:

بھائی! میری گزارش یہ ہے کہ اپنے میں سبب تلاش کریں۔ہم اپنے اندر دیکھیں کوئی ہمارے اندر کمی آئی ہے۔اس وقت اندھیری رات کی طرح فتنے ہیں اور علم کی روشنی ہے، اندھیروں کے دُور ہونے کا ذریعہ ہے۔نہ وہ اندھیرا میرے ڈنڈے سے جاتا ہے نہ منت وخوشامد سے جاتا ہے۔نہ وہ صلوٰۃ حاجت سے جاتا ہے، سارے سجدے میں پڑیں یا اللہ! یہ اندھیرا تو لے جا۔ابے بدھو! لائٹ جلا۔اللہ کے نظام میں غور کیوں نہیں کرتا۔اللہ کی سنت کے خلاف کیوں کرتا ہے۔

بغیر شادی کے سجدے میں سر رکھا ہے، اے مریم کو بن باپ کے بیٹا دینے والے۔اے حوا کو بغیر ماں کے پیدا کرنے والے۔مجھے بھی بیٹا دے دے۔تو اس کو تو جوتے مارو۔جو اللہ کی سنت کو نہیں سمجھا۔

تو بھائی! اندھیرے کے لیے ایک دیا سلائی، ایک چراغ، ایک شمع کافی ہے ... اندھیرے زیادہ ہوں گے تو چراغ زیادہ جلانے پڑیں گے۔ایک کمرے کا اندھیرا ہے تو ایک چراغ ہی کافی ہے۔ایک شمع ہی کافی ہے۔ٹمٹماتا چراغ ہی کافی ہے۔چراغ مفلس جو میر تقی میر نے کہا تھا، چراغ مفلس ہی کافی ہے ...اور جب اتنی بڑی مسجد ہو تو ایک چراغ کافی نہیں دو، چار، دس چراغ جلانے پڑیں گے ...اور جب سارا پنڈی اندھیرے میں ہو تو

پھر اس کے حساب سے شمعیں جلانی پڑیں گی ...اور جب سارا جہاں اندھیرے میں ہو تب کتنی شمعوں کی ضرورت ہے ... " اللہ رات کے اندھیرے کو سورج کی روشنی سے بھگاتا ہے۔ باطل کے اندھیرے کو اللہ وحی کے علم کی روشنی سے بھگاتا ہے۔"

بھائی! یہ شعبہ تو نہ ہوا یہ تو کُل ہوا۔ سورج کُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چاند، ستارے اس کے شعبے اور اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سورج آتا ہے تو ہر شے سے انسان مستغنی ہو جاتا ہے۔ شمعیں بجھا دو، چراغ گُل کر دو، بتیاں بجھا دو، کیا ہوا؟ آ گیا۔ اَلشَّمۡسُ طَالِعَةٌ. تو آج کا جو اندھیرا ہے یہ جلوسوں سے نہیں بھاگے گا۔

یہ جلسوں سے نہیں بھاگے گا، یہ سٹرائکوں سے نہیں بھاگے گا، اس کے خلاف تقریریں کرنے سے نہیں بھاگے گا۔

رواجی سند:

افراد تیار کرو! اپنے آپ کو تیار کرو! اپنے سینوں کے اندر اللہ کے علم کو اتارو۔

میرے عزیزو! رواجی سند لینے سے اللہ کے ہاں عالم ہی نہیں کہلا سکتے۔ بھائی! اب وفاق کی سند لینا یہ تو اللہ کے ہاں علم کا معیار نہیں بن سکتا۔ ہاں! چونکہ دنیا ایک نظام سے چلتی ہے تو یہ ہمارا ایک نظام ہے۔ کوئی تو دلیل ہونی چاہیے کہ ہاں یہ شخص پڑھا ہوا ہے۔ تو یہ ایک نظام بنایا گیا۔ وہ نظام ہماری ضرورت کے لیے ہے نہ کہ علم کی ضرورت کے لیے، نہ کہ علم کے معیار کے لیے، تو اس وقت ہمیں اشد ضرورت ہے ایسے نوجوانوں کی جو اپنے آرام کو، راحت کو، اپنی خواہشات کو، لذتوں کو کہیں جا کے دفن کر دیں۔

سَابَغِ الۡمَجۡدَ فِیۡ شَرۡقٍ وَغَرۡبٍ وَمَا سَائَلُ فَتیٰ دُوۡنَ افۡتِرَابِ

بھول جائیں ہر چیز۔

ابوجعفر منصور کا خواب اور امارت کا اشارہ:

ابوجعفر منصور جو تھا ناں بڑا عالم تھا۔ بہت بڑا عالم تھا۔ گردشِ ایام، تقدیر کا قلم اس کو اٹھا کے تخت شاہی پہ لے آیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ مجھے تخت ملے گا۔ ہشام بن عبدالملک کا دَور تھا۔ طاقتور اموی خلیفہ، آخری طاقتور خلیفہ جس کے بعد زوال شروع ہوا، اس نے خواب دیکھا عرفات کے میدان میں تھا تو ایک آدمی سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں گدھے پر سوار ہوں اور گدھے پر بھوسہ ہے اور انجیر ہے۔ دو گٹھڑ ہیں اس کے اوپر میں سوار ہوں ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے اور نام نہیں بتایا۔ معبر نے کہا: جس نے یہ خواب دیکھا ہے وہ عنقریب بنوامیہ کے تخت کا مالک بنے گا اور ابوجعفر نے کہا: میں نے جوتا اٹھایا اور بھاگا، بھاگا، بھاگا کہ کہیں یہ نہ پتہ چل جائے کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور میری گردن نہ ماری جائے۔ یہ کیسا احمق ہے جس نے میری بے بسی کا مذاق اُڑایا ہے۔ بنوامیہ کا تخت کیا لگے؟ اور ابوجعفر منصور کیا لگے؟

صرف پندرہ سال بعد وہ تخت اس کے قدموں میں آ گیا۔ ایک دن اس سے کسی نے کہا: اب بھی کوئی خواہش ہے جو باقی ہو؟... کہنے لگا: ہاں ایک تمنا لیے قبر میں ہی چلا جاؤں گا۔... کہا: وہ کیا ہے؟ کہا: میں نے علم سیکھا تھا۔ میری بڑی تمنا تھی میں بیٹھتا، میرے چاروں طرف طلبہ کا ہجوم ہوتا اور وہ مجھ سے کہتے: حَدِّثْنَا اور میں ان کو کہتا: حَدَّثَنِیْ فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ. کہا: یہ تمنا میرے اندر رہ گئی۔

تو یہ آپ کو پتہ ہے درباری کیسے زبردست لوگ ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کو برباد کرنے والے لیکن اس زمانے کے بادشاہ بڑے سیانے تھے، ان کے چکر میں آتے نہیں تھے۔ آج کل کے بیوقوف ہیں، وہ چکر میں آجاتے ہیں تو اگلے دن وہ سارے درباری، قلم دواتیں اور کاغذ پکڑے آ گئے۔

کہا: حَدِّثْنَا يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! امیرالمؤمنین! ہمیں آپ سنائیے۔ تو وہ مسکرا کے کہنے لگا: لَسْتُمْ بِهِمْ، لَسْتُمْ بِهِمْ. عربی کا محاورہ ہے۔ اس کا محاورے میں ہماری زبان میں ترجمہ ہے: یہ مُنہ اور مسور کی دال۔ سمجھے ہو؟ لَسْتُمْ بِهِمْ۔ یہ مُنہ اور مسور کی دال۔

یہ مُنہ اور مسور کی دال، محاورے کی ابتدا:

یہ سنا ہوا ہے ناں۔ اس کے "شانِ نزول" کا بھی پتہ ہے۔ شام عالم ثانی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی دلّی میں آ گئی تھی اور حکومت شام عالم کی نظر آتی تھی، پیچھے قبضہ انگریز کا تھا۔ پھر بہادر شاہ ظفر جنگ آزادی میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ تو اس کا جو باورچی تھا محمد حسین اُس کا نام تھا اس نے دیکھا بھائی اب تو ڈوب گیا مغل کا اقتدار، کہیں اور چلیں۔ اس وقت بہاولپور میں عباسی سلطنت طاقتور تھی۔ تو وہ دلّی سے چلا بہاولپور، احمد پور شرقیہ تھا اس وقت ان کا دارالحکومت بہاولپور تو بعد میں بنا، یہاں آ رہا تھا۔ راستے میں مہاراجہ تھا رنجیت سنگھ تو اس سے ملاقات ہوئی اس نے کہا: میرے پاس ہی نوکری کر لو، اتنی دُور کیوں جاتے ہو؟

کہنے لگا: چلو تیرے پاس کر لیتا ہوں۔ کیا لو گے؟

اس نے کہا: حضرت میں تین سو روپیہ اور کھانا لیتا تھا۔

کہنے لگا: یہ تو بہت زیادہ ہے۔ وہ تو دلّی کا بادشاہ میں تو پنجاب کا۔ میں تو اتنا نہیں دے سکتا۔ میں تو تمہیں سو روپیہ اور روٹی دے سکتا ہوں۔... کہا: چلو ٹھیک ہے، پردیس ہے، منظور ہے۔... اس نے کہا: میرے گھر کے سولہ افراد ہیں، ان کے لیے کھانا تیار کرنا ہو گا۔ ہفتے کے بعد حساب دینا ہو گا۔... کہا: ٹھیک ہے تو اس نے پہلے دن مسور کی دال پکائی تو رانی جنداں تر نجیت سنگھ کی بیوی تھی۔ رنجیت سنگھ پنجاب پہ حکمران تھا وہ رنجیت پہ حکمران تھی اس نے جو پہلا لقمہ لیا، کہنے لگی: آہا! آہا یہ کس نے پکائی؟... اس نے کہا: ایک نیا باورچی رکھا ہے۔... کہا: پورا ایک ہفتہ دال پکنی چاہیے۔... تو پورا ہفتہ مسور کی دال چلی۔... ہفتے بعد رنجیت سنگھ نے

حساب مانگا تو اُس نے بہتر روپے خرچہ بتایا۔ اس نے کہا: تیرا بیڑا غرق ہو جائے تو نے دال پہ بہتر روپے لگا دیئے تو گوشت پہ کیا لگائے گا۔ تو میرے وارے کا نہیں ہے۔

اُس نے کہا: جی دال تو دو آنے کی ہے، اکہتر روپے چودہ آنے کے لوازم لگے۔ ...کہا: بھائی! یہ مغلوں کو مبارک، تو تو میرا خزانہ خالی کرے گا۔ چھٹی کر۔ کہا اس سے کم درجے کی میں پکا نہیں سکتا وہ چلا گیا۔ دوپہر کا کھانا آیا تو مرغا۔ تو جنداں نے جب بوٹی توڑی تو اُٹھا کے دیوار پہ ماری، کہا: یہ کس نے پکایا؟ ...انہوں نے کہا: یہ نیا باورچی؟ ...کہا: محمد حسین کہاں گیا؟ ...کہا: اُس کو نکال دیا گیا۔ ...کہا: تیری ایسی تیسی تو کون ہوتا ہے نکالنے والا، بلاؤ اُس کو۔ ...اس نے کہا: بھائی مارے گئے جو اللہ سے نہیں ڈرے اپنی بیوی سے تو ضرور ہی ڈرے۔ بلاؤ اس کو بھائی۔ اب بھاگے اس کے پیچھے تو یہ رائیونڈ کے مضافات میں پکڑا گیا۔

اس سے کہا: چلو تمہیں مہاراج بلاتے ہیں۔ ...اس نے کہا: دفع ہو جاؤ "یہ مُنہ اور مسور کی دال"۔ ...یہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور ہمارے اُردو میں ضرب المثل بن گیا۔

وَعِنْدَ جُهَيْنَةَ الْخَبَرُ يَقِيْنُ. ایسے ہی جو محاورے بنتے ہیں ناں۔ کوئی پیچھے واقعہ ہوتا ہے۔ صاحب معاملہ سے کوئی خوبصورت جملہ نکلتا ہے، ضرب المثل بن جاتا ہے۔

خیر میں آپ کو محاوروں کی کہانیاں سنانے نہیں بیٹھا۔ اس نے کہا: میں نہیں جانتا تو ان سے اُلجھ گیا۔ ان سے لڑتے لڑتے مارا گیا، واپس نہیں گیا۔

کانا کافر:

میں نے آپ سے ایک بات کی تھی کہ علم تو کُل ہے۔ باقی تو ایک جز ہے۔ اس پر ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ پتا نہیں سچا ہے یا جھوٹا لیکن ہے کتابی بات۔ لیکن بے سند کے ہے رنجیت سنگھ کا وزیر مسلمان تھا۔ اس نے کہا: بھائی میرا نام تمہارے قرآن میں ہے؟

اس نے کہا: جی ہے۔ ...کہا: علماء سے پوچھ کر تلاش کر کے بتاؤ۔ وہ ایک میراثی کے

پاس گیا۔ وہ کہنے لگا مجھے لے جائیں۔ کہنے لگا: تو کیسے دے گا؟ کہا: تم مجھے لے تو جاؤ اگلے دن وہ آ گیا۔ اسے لے کر گیا۔ کہا: ہاں! بھائی مل گیا جواب۔ بول بھائی میرا نام تمہارے قرآن میں ہے؟ ایک آنکھ لڑائی میں ضائع ہوگئی تھی۔ اس نے کہا: جی ضرور ہے۔... کہاں ہے؟ کہا: ایک دفعہ بتاؤں، دس دفعہ بتاؤں؟... کہا: ایک ہی دفعہ بتا دے۔... کہا: ہمارا قرآن پکار پکار کے کہہ رہا ہے: وَمَا كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ، وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. ایک کافر ہوگا جو کافروں میں سے ہوگا۔ ایک کانا ہوگا جو کافروں میں سے ہوگا تو بھائی! ہمارے پاس تو ایسا کُل ہے جو رنجیت سنگھ کو بھی کھا گیا۔ وہ لاجواب ہوگیا۔ یہ تو خیر پتہ نہیں کہاوت سچی ہے یا جھوٹی، بہرحال ہے کتابی چیز۔

جٹ کا چپھا:

لیکن ایک قصہ سچا ہے۔ معتبر کتابوں میں ہے کہ جو کام علماء نہ کر سکے ایک مسخرے نے کر دیا۔ قرآن کا مخلوق ہونا۔ جب معتزلہ نے فتنہ اُٹھایا کہ قرآن مخلوق۔ مامون جیسا دانا آدمی بھی اس سحر کا گرفتار ہوگیا۔ معتصم تو ویسے ہی اَن پڑھ تھا، وہ تو اپنے بھائی کی وجہ سے۔ مامون مرتے ہوئے وصیت کر گیا تھا تو اپنے ماموں کی وجہ سے اس پر چلا۔ واثق باللہ کا دَور آیا، واثق آخری خلیفہ تھا، جہاں اس فتنے نے دَم توڑا۔ بڑے دلائل اور عبدالعزیز کنانی کا مناظرہ مشہور ہے۔ جو مامون کے دربار میں معتزلہ سے ہوا۔ پھر احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مناظرہ ہوا۔ احمد بن ابی داؤد کے ساتھ اور بشر مریسی کے ساتھ عبدالعزیز کنانی کا ہوا لیکن یہ فتنہ نہ ٹوٹ سکا۔

ایک درباری میراثی صبح صبح روتا ہوا آیا۔ واثق باللہ کے پاس۔ کہا: امیرالمؤمنین! عَظَّمَ اللّٰهُ اَجْرَكَ فِي الْقُرْاٰنِ. جیسے ہمارے ہاں کوئی مرگ ہو جائے تو ہم کہتے ہیں اللہ آپ کو صبر دے۔ اللہ آپ کو ہمت دے تو عربی میں عَظَّمَ اللّٰهُ اَجْرَكَ. اللہ آپ کے اجر کو زیادہ

کرے۔فلاں کے بارے میں۔

تو اس نے کہا: امیر المؤمنین آج بڑی خوفناک خبر آئی ہے۔اللہ آپ کو ہم سب کو اس میں صبر جمیل عطا فرمائے۔...کہا: کیا ہوا؟...کہا: قرآن فوت ہوگیا اور یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا۔اب نمازوں میں قرآن کون پڑھے گا؟...اب تراویح میں قرآن کون پڑھے گا؟...قرآن فوت ہوگیا...او تیرا بیڑا غرق ہو جائے! قرآن بھی فوت ہو سکتا ہے؟...کہا: امیر المؤمنین تھا! کُلُّ مَخْلُوقٍ هَالِكٌ. ہر مخلوق نے مرنا ہے۔قرآن بھی مخلوق، وہ کل مر گیا بیچارہ۔واثق باللہ کی آنکھیں کھل گئیں۔اس نے کہا: تیرا بیڑا اتر جائے۔یہ انہوں نے کیا بات کہہ دی۔ جہاں دلائل نہ کام دے سکے، ہمارے پنجابی میں کہتے ہیں "جٹ چھا" وہ جٹ کا چھا لگ گیا۔

خصوصیاتِ طلبۂ حدیث:

اُس نے کہا: لَسْتُمْ بِهِمْ. تم وہ نہیں، تم وہ نہیں ہو، علم والے طلبہ، پتہ ہے وہ کون ہوتے ہیں؟

"اِنَّمَا هُمُ الدَّنِسَةُ ثِيَابُهُمْ، اَلْمُشَقَّقَةُ اَرْجُلُهُمْ، اَلطَّوِيْلَةُ شُعُوْرُهُمْ، رُبَابُ الْاٰفَاقِ، وَقُطَّاعُ الْمَسَافَاتِ، تَارَةً بِالْيَمَنِ تَارَةً بِالْحِجَازِ، تَارَةً بِالشَّامِ، تَارَةً بِالْعِرَاقِ، اُولٰئِكَ نَقَلَةُ الْحَدِيْثِ."

کہا: وہ پراگندہ بال، پھٹے پاؤں، شکستہ حال، مسافتیں طے کرنے والے، دُور دراز کے سفر کرنے والے، آفاق کی بلندیوں کو چھونے والے، سورج کی طرح کبھی یمن سے طلوع، کبھی عراق سے طلوع، کبھی شام سے طلوع، کبھی حجاز سے طلوع، کبھی ان کا سفر عراق کا، کبھی شام کا، کبھی یمن کا، کبھی حجاز کا۔ یہ ہیں حدیث کے لینے والے، تم کہاں سے آ گئے ہو؟

کیسے طلبۂ علم کی ضرورت ہے:

میرے عزیزو!

اندھیرا بہت زیادہ ہے۔اس کے لیے صرف وفاق کی سند سے کام نہیں چل سکتا۔ایسی کھیپ

تیار کرنا ہم پر فرض عین ہو چکا ہے۔ جن کے روئیں روئیں میں علم کی شمعیں جل چکی ہیں۔

يَتَفَجَّرُ الْعِلْمُ مِنْ جَوَانِبِهٖ کا نمونہ ہوں۔...وَتَنْطِقُ الْحِكْمَةُ مِنْ نَوَاحِيْهِ حکمتوں کا مظہر ہوں۔...روئیں، روئیں سے علم کے چشمے اُبلتے ہوں۔...يَسْتَوْحِشُ مِنَ الدُّنْيَا وَزَهْرَتِهَا. دُنیا اور اس کی زیب و زینت سے بیزار ہوں۔...وَيَسْتَأْنِسُ بِاللَّيْلِ وَظُلْمَتِهٖ. رات کے اندھیروں سے جن کا جی لگتا ہو۔...اگر ایسے لوگ ہم نے تیار نہ کیے تو یہ مدرسے مٹ جائیں۔ عمارتوں کا نام مدرسہ نہیں ہے۔ ترکستان کے مدارس دیکھو جا کے کتنے بڑے بڑے تھے۔ ماوراء النہر کے علماء نے احناف پہ کتنا احسان کیا ہے؟ ختم۔ دیمک کہیں سے لگ چکی ہے۔ لہٰذا اندر سبب تلاش کرو۔

دِل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ھُو
وچ بیڑے وچے جھیڑے وچے ونجھ مہانے ھُو

یہ فساد کہیں اندر سے ہے۔ ایسے نہیں کسی کی نگاہ اُٹھا کرتی۔ جب بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں پھر نہیں کوئی قریب آیا کرتا۔ ہمیشہ کمزور بنیادوں پر ہی رال ٹپکا کرتی ہے۔

راہبری کا سوال:

تو اس وقت جس علم کی ضرورت، تو اس میں تو ایک حرف بھی نہیں کوئی کم کر سکا۔ نہ اس میں کوئی تحریف کر سکا۔ نہ اس کو کوئی بدل سکا۔ نہ اس میں کوئی کمی زیادتی کر سکا۔ جو اس کے حاملین تھے ان سے ہمیں گلہ ہے ؎

تو اِدھر اُدھر کی نہ بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں تیری رہبری کا سوال ہے

ڈاکے تو صدیوں سے پڑ رہے ہیں۔ جب رہبر بینا اور دانا تھے تو (ڈاکو) ناکام ہوتے رہے۔

جب راہبروں کو اونگھ آنے لگی، جب میرِ کارواں غافل ہوئے، جب میرِ کارواں خوابِ خرگوش کا شکار ہوئے تو تب راہزنوں کے حملے کامیاب ہونے لگے۔ تو اب رہزن سے کیا گلہ کریں رہزن تو چودہ سو سال سے حملہ کر رہے ہیں۔

ہم تو میرِ کارواں سے گلہ کریں گے تو کہاں تھا؟ مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں تیری رہبری کا سوال ہے۔...تم کہاں سوئے ہوئے تھے؟...دنیا کا کوئی کام علم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔...یہ باقی سارے شعبے ہیں اس کے۔ ...دیکھو ناں! معدہ ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ ...جب معدے میں فساد آتا ہے۔ ...تو ہاتھ کمزور، نظر کمزور، دماغ کمزور، چلنا کمزور، بیٹھنا کمزور۔... اب کوئی ہاتھ کے علاج کو لگ جائے، کوئی پاؤں کے علاج کو لگ جائے۔ ...

بھائی! یہ تو وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اصل جڑ جہاں علم میں ضعف آ چکا ہے۔ رسوخ کے لحاظ سے بھی صفات کے لحاظ سے بھی۔

علم کی نشانی:

اللہ تعالیٰ نے کیا کہا: جو میں نے شروع میں آیت پڑھی تھی علم کی نشانی کیا بتائی؟ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ. جو راتوں کو اُٹھ رہے ہوں، رو دھو رہے ہوں، قیام و سجدے میں ہوں، خوف و اُمید کے درمیان ہوں، اس کے بعد اللہ نے کہا: کبھی جاننے والا اور نہ جاننے والا بھی برابر ہوئے؟

پھر کہا: اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ. عقل والے، فہم والے یہ تو نصیحت پکڑتے ہیں۔ یہاں اُولُوا الْاَلْبَابِ پر بات ختم ہوگئی۔ يُفَسِّرُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا کے تحت میں ایک اور مضمون اُولُوا الْاَلْبَابِ کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ جس سے ایک عالم کی تصویر قرآن سے باہر نکل آئے گی۔ قرآن کا کیمرہ ایک تصویر پیش کر رہا ہے۔ جس کا پہلا مصداق علماء ہیں، مطلوب تمام دُنیا کے اہلِ ایمان سے وہ صفات ہیں۔ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى.

قرآن میں متضاد کا تقابل:

اچھا! ایک اور بات اس میں ایک دَم ذہن میں آ گئی، بات تو میں نے اگلی کرنی ہے لیکن بات اور ایک ذہن میں آ گئی۔ وہ فائدے کی ہے۔

قرآن متضاد چیزوں کا تقابل کرتا ہے۔

ظل،حرور... جنت ،جہنم ...آزادی ،غلامی ...علم ،جہل ...عزت ،ذلت ...فقر، غنا ...اموات ،احیا...

یہ ہے قرآن کا طرز جو سارے قرآن میں (چلتا ہے)۔

لَآ يَسۡتَوِیٓ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَاَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ، قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِی الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ.

حقیقی اندھا و بینا:

یہ ایک جگہ ایسی جہاں قرآن کا تقابل ظاہری طور پر سمجھ نہیں آتا۔

اَفَمَنۡ يَّعۡلَمُ اَنَّمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَقُّ.

جو علم کی حقانیت کو جانتا ہے، كَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰى ۔ وہ اور اندھا برابر ہو سکتے ہیں۔ تو علم اور اندھے پن کا آپس میں جوڑ تو کوئی نہیں۔ علم اور جہل کا جوڑ تو ہے۔

جیسے میں نے پہلی آیت پڑھی۔ يَعۡلَمُوۡنَ، لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن علم رکھنے والا اور اندھا کیا یہ برابر ہو سکتے ہیں۔ تو ظاہراً تقابل نقیضین کا نہیں ہے۔ نقیضین کا تقابل نہیں ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ دُنیا میں دیکھنے والے صرف وہی ہیں جو علم والے ہیں۔ باقی سارا جہاں اندھا ہے۔ باقی سب اندھے ہیں۔ كَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰى ۔ تو جب سارا نظام اندھوں کے ہاتھ میں ہے، ان سے کہنا تم دیکھو۔ یہ تو طلب محال ہے۔ منطق فٹ کرو ناں یہاں۔ کچھ تو حسی مثالیں طلبہ کو سمجھاؤ ان کو پتہ تو چلے، تطبیق کیسے کرنی ہے۔ جب آبا نہیں ہوگا وہ تو تطبیق نہیں کر سکیں، ادھر آتو ہے،

نہیں یا بھی ہے، نہیں۔ میں تطبیق کیسے کروں؟ ایسا فرسودہ امثلہ کا نظام جس کا واقعہ سے دُور کا تعلق ہی کوئی نہیں۔ تو تطبیق کیسے کریں گے۔

تو اندھے سے کہنا: دیکھو یہ طلب محال نہیں؟ ... یہ تو مطالبہ کرنے والا نادان ہے۔ جو اندھے سے کہہ رہا ہے دیکھو!... سارا جہاں اندھا، دیکھنے والا کون؟ ''مَـا اُنـزِلَ اِلَیۡكَ مِـنۡ رَّبِّكَ الۡحَقُّ'' جو یہ جان گیا کہ یہ حق ہے، وہ بینا ہے چاہے اندھا ہی کیوں نہ ہو۔

عجمی مفتی:

عطاء بن ابی رباح حجاز کے مفتی تھے۔ عبدالملک بن مروان کہنے لگا عامر شعبی سے: حجاز کا مفتی کون ہے؟ ...انہوں نے کہا: عطاء بن ابی رباح۔ ...کہا: کون ہے؟ عرب ہے، موالی ہے؟ ...کہا: موالی ہے، غلاموں میں سے۔ ...کہا: یمن کا مفتی کون ہے؟ ...کہا: طاؤس یمانی۔ ...کہا: وہ عرب ہے یا موالی؟ (عربی ہے یا عجمی) ...کہا: عجمی ہے۔ ...کہا: شام کا مفتی کون ہے؟ ...کہا: مکحول ہے۔ ...کہا: وہ عربی ہے یا عجمی ہے؟ ...کہا: عجمی ہے۔ ...کہا: خراسان کا مفتی کون ہے؟ ...کہا: ضحاک بن مزاحم۔ ...کہا: وہ عربی ہے یا عجمی ہے؟ ...کہا: عجمی ہے۔ ...کہا: مصر کا مفتی کون ہے؟ ...کہا: حبیب بن ابی تمام ہے۔ ...کہا: وہ عربی ہے کہ عجمی ہے۔ ...کہا: عجمی ہے تو عبدالملک کا رنگ فق ہوتا جارہا، نیلا پڑتا جارہا۔ ...کہا: بصرے کا مفتی کون ہے؟ ...کہا: وہ حسن بصری ہے۔ ...کہا: وہ عجمی ہے کہ عرب ہے؟ ...کہا: عجمی ہے۔ ...کہنے لگا: عراق کا مفتی کون ہے۔ ...تو کہنے لگا: اب اگر میں نے کوئی عجمی بتادیا تو یہ میری گردن مار دے گا۔ تو میرے جی میں آیا کہ میں کہوں حماد ہے لیکن پھر میں موت سے ڈرا۔ میں نے کہا: ابراہیم نخعی ہے۔ نخعی کہنا ہی کافی ہے۔ نخع تو عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ تو عبدالملک نے کہا: ہاں اب تو اگر کسی عجمی کا نام لیتا تو میری جان نکل جاتی۔ میں مرجاتا۔

یہ جو بن باز تھے، ابھی عرب کے مفتی یہ بھی موالی میں سے تھے۔ عرب نہیں تھے موالی

میں سے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح کا مقام اور مرتبہ:

تو عطاء بن ابی رباح جو تھے سارے حجاز کے مفتی تھے ان کا ذرا ظاہری حلیہ سن لینا:

اَسْوَدُ : کالے ...اَخْتَصُ :چپٹی ناک ...اَعْمٰی : اندھے ...اَشَلُ : لُنجے ... اَعْرَجْ : لنگڑے اور سارے حجاز کے مفتی۔

ایوب آ کے بیٹھا ان کی مجلس میں۔ ایوب ولی العہد سلیمان کا بیٹا۔ جس کے مرنے کے بعد اس نے خلافت کی وصیت عمر بن عبدالعزیز کے لیے کر دی، ورنہ اس نے اپنی طرف سے ایوب کو طے کیا تھا۔ وہ پہلے مر گیا زندگی میں۔ ...اگر کسی نے کہا: حضور! ایوب آیا بیٹھا ہے ...تو فرمانے لگے۔ مجھے پتہ ہے آیا ہوا ہے لیکن میں اسے اور اس کے باپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں تمہاری اور دولت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

سلیمان بن عبدالملک آیا ان کی مجلس میں اور متأدب تھا علماء کا۔ ایسے ادب سے بیٹھا، بچے بھی بیٹھے اور انہوں نے استغنا کا رخ رکھا۔

وہ پوچھتے اور وہ اپنی نیازی سے بتاتے تھے حج کے مسائل۔ باہر نکل کر کہنے لگا: بیٹو! علم سیکھو، دیکھا تم نے ایک کالے کے سامنے میں کیسے ذلیل ہوا ہوں، علم سیکھو! أعمیٰ سے کچھ واقعات یاد آ گئے۔

علماء کی ذمہ داری اور عالم میں وبا کی کیفیت:

جو یہاں اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ جو علم والا ہے وہ ہے بینا، باقی تو سب اندھے ہیں۔ اب آپ اندھے سے کہہ رہے کہ راستہ دیکھ کے چلو۔ کیسے دیکھے؟ دکھاؤ ان کو تو آپ کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے۔ یہی تو ہم تبلیغ والے رو رہے ہیں کہ دُنیا تو باطل کا نوالہ بن رہی ہے۔ جب وبا پھیل جاتی ہے پھر باہر جا کر علاج کرنے پڑتے ہیں۔

جب وبا کوئی نہ ہو تو جو ہسپتال میں آ جائے اس کا علاج کرو لیکن جب وبا ہو جاتی ہے تو پھر جگہ جگہ کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ ہسپتالوں سے لڑکوں کو، کالجوں سے لڑکوں کو بھگایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر، پروفیسر، کمپاؤڈر، حکیم کیا، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی سب بھاگ کے باہر آ جاتے ہیں۔ پھر یہ انتظار نہیں کرتے کہ اب جو ہسپتال میں آئے گا ہم اس کا علاج کریں گے۔

ارے میرے عزیزو!

وبا ہے وبا، ہم لوگوں میں پھرتے ہیں، آپ پھرتے نہیں ہیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے۔

لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ ... شنیدہ کہ بود مانند نہ دیدہ... بالکل ارتداد کے کناروں پہ نسل پہنچی ہوئی ہے۔ انٹرنیٹ نے اور کیبل نے اور کمپیوٹر نے ایمان چھین لیا ہے، نسل سے۔ ایک ہوا کا جھونکا انہیں کفر میں جا کے پھینک دے گا۔ ایک ہوا کا جھونکا۔ ...نہ وہ آپ کی کتابیں پڑھتے ہیں۔...نہ وہ آپ کی باتیں سنتے ہیں۔...نہ وہ آپ کی مسجد میں آتے ہیں۔ ...نہ کسی اہل اللہ سے ان کا تعلق اور واسطہ ہے۔...وہ کسی اور نگری میں ہیں۔ تو یہ وبا ہے وبا کے دنوں میں بیٹھنا جائز نہیں رہتا۔

طبیب کو مریض سے نفرت نہیں:

اندھوں کو راستہ تو آپ نے بتانا ہے۔ اگر اس سے نفرت کریں گے تو علاج کیسے ہو گا؟ آپ کا اور عوام کا تعلق ہے طبیب اور مریض کا۔ اگر مریض سے طبیب نفرت کرے تو علاج کیسے ہوگا؟ ۲۰۰۰ء میں آخری عشرۂ رمضان میں نے گزارا حرم شریف میں، اپنے بچوں کو بھی لے گیا۔ رات کو میرے بڑے بچے کو ایک دم تکلیف ہوگئی۔ کوئی کھانے میں بے احتیاطی ہوئی بڑی طبیعت اس کی خراب ہوگئی۔ وہ تھی پہلی جنوری کی رات۔ تو ہم نے کہا: چلو حرم میں گزاریں۔ اس رات میں ساری دنیا میں بہت نافرمانی ہو رہی۔ تو اس کے عوض میں ہم اللہ کے گھر میں بیٹھ کے کچھ اپنے لیے بھی توبہ کریں گے، امت کے لیے بھی توبہ کریں

گے۔یااللہ! معاف کردے! نادانی میں کررہے ہیں۔

لیکن وہ ایسی آفت آئی کہ مجھے بھی اور میری بیوی کو بھی بچے کو لے کر ہسپتال جانا پڑا۔تو لفٹ میں اوپر جو ہم جارہے تھے۔تو وہاں ہسپتال کا جوانچارج تھا ڈاکٹر وہ پاکستان کے فیصل آباد کے تھے۔تبلیغ میں چار مہینے لگے ہوئے تھے۔اس سے ہمارا تعلق تھا۔ان کو میں نے فون کردیا۔تو وہ ہسپتال کے دروازے پر آگئے تھے۔

ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو میرے بچے کو اُلٹی آئی۔

میں باپ ہوتے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکا۔ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ ایسے کردیئے اور ساری اُلٹی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔آپ یقین جانیں میرے دِل پر اتنا اثر ہوا کہ میں باپ ہوں، میں نہیں یہ کام کرسکا۔اس کا منصب ایسا تھا کہ اسے یہ کام کرنا تھا۔اگر وہ اس سے نفرت کرتا تو علاج کیسے ہوتا؟

اب آپ تو ہیں طبیب آپ نے نفرت شروع کردی تو علاج کیسے ہوگا۔یہ بھی قابل علاج ہے جو آپ کے اندر نفرت کے جذبات ہیں۔ان کا بھی علاج ہے۔تبلیغ کے دھکوں کے سوا یہ علاج کہیں سے نہیں ملے گا۔آپ کو کسی عقیدت سے نہیں کہہ رہا ہوں، بصیرت سے کہہ رہا ہوں۔

دُنیا تو بڑی قابل رحم ہوئی پڑی ہے۔جو اپنے درخت کو خود کلہاڑے سے کاٹ رہا ہو، اُس سے بڑا نادان کون ہوگا؟ اسے تو سمجھانے کی ضرورت ہے۔آپ اپنے اندر ہمدردی پیدا کریں اور اپنی کمیاں دیکھیں کہ ہمارے اندر کہاں کمی آئی ہے۔

مدارس کے خلاف یلغار

اور

ہماری ذمہ داریاں

جامعۃ الرشید میں منعقدایم بی اے کے تعارفی سیمینار سے خطاب

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

۲۲ رجب ۱۴۲۷ھ بمطابق 18 اگست 2006ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(خطبۂ مسنونہ کے بعد)

معزز مہمانانِ گرامی اور میرے عزیز طالب علم ساتھیو!

سب سے پہلے میں ان اساتذہ کرام اور علمائے کرام کا شکریہ ادا کروں گا جو آج کی محفل کی سرپرستی کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس کے بعد میں ان تمام فضلائے کرام کو بھی خوش آمدید کہوں گا جن کے سر پر اللہ کے فضل وکرم سے اس سال دستارِ فضیلت سجی ہے اور وہ مستقبل میں دین کا کام کرنے کے لیے، دین کی محنت اور دعوت میں عملاً حصہ لینے کے لیے متفکر ہیں اور اپنی محنتوں کا محور تلاش کرنے کے لیے انہوں نے ہماری دعوت قبول کی اور یہاں تشریف لائے۔

صورتِ حال اس وقت یہ ہے کہ دینی اداروں کی طرف عوام اور خواص، اپنوں اور غیروں، دوستوں اور دشمنوں سب کی توجہ بڑھتی جا رہی ہے۔ جب دشمن نے دینی اداروں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا، منفی ذہن سازی شروع کی، ان کا وقار مجروح کرنے کی کوشش کی...... تو چونکہ ان اداروں کے بانیان اور منتظمین کی نیت میں اخلاص کامل تھا...... اس لیے اس پروپیگنڈے کا اثر صرف ان لوگوں کے ذہن پر پڑا جن کے دل پہلے سے داغ داغ تھے۔ جن حضرات کے دل میں ایمان کی روشنی تھی وہ اس سے بچے رہے۔

پہلی سازش...... مغرب اس وقت مدارس کے خلاف تین طرح کی کوشش کر رہا ہے۔

پہلی کوشش یہ ہے کہ دنیا والے اہلِ مدارس سے ایسے ہی بیزار...... اور یہ دنیا والوں کے لیے ایسے ہی نامانوس ہو جائیں جیسے کہ خود ان کے یہاں عیسائی مذہبی ادارے معاشرے پر اپنی گرفت کھو چکے ہیں اور روز بروز بے بس ولاچار ہوتے جا رہے ہیں۔ عیسائیت کا کردار مغربی دنیا میں صرف اتوار کی سروس تک ہے۔ صرف اس دن گناہوں کے زائل کرنے کے لیے چھینٹے دینے پر اور فیس بھرنے تک ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام کے نام لیوا اور اس کے داعی...... یہ بھی مساجد تک محدود ہو جائیں اور دم درود، نذر

ونیاز کے علاوہ ان کا معاشرے میں کوئی کردار نہ ہو۔ اس رواں دواں زندگی، جیتے جاگتے معاشرے اور ہر پل بدلتے عالم سے ان کو کوئی سروکار نہ ہو۔ ان کو متحرک وفعّال زندگی سے کاٹ کر آثارِ قدیمہ کی سی حیثیت دلا دی جائے۔ کیا ہم اور آپ یہ ذلت برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارے اکابر کا طرزِ عمل ایسے مواقع میں یہی رہا تھا؟ ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اہلِ مغرب اور ان کے ہمنوا چاہتے ہیں کہ سارا معاشرہ ایک اور انداز میں سوچے اور اہلِ مدارس اپنی زندگی کا مقصد کسی اور چیز کو بنا کر چل رہے ہوں۔ یہ اہلِ مدارس ایک ایسے گوشے میں محصور کر دیے جائیں جہاں ان کی بات سمجھنے اور سننے والا کوئی نہ ہو۔

عمدہ نتائج کی توقع......اس کے مقابلے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے شعبۂ تعلقات عامہ کے کردار کا از سرِ نو جائزہ لیں۔ پبلک ڈیلنگ ایک مستقل فن ہے۔ آپ عوام سے کٹ کر نہ رہیں، ان میں نفوذ کریں اور ان کے ساتھ رابطے استوار کریں اور مدارس کی نافعیت اور اہل مدرسہ کی اہمیت اور مدارس کے نصاب ونظام کے معیار اور کارکردگی سے ان کو آگاہ کریں اور ان کو یہ باور کرائیں کہ ہم آپ کی ضرورت ہیں...... ہمارے بغیر آپ کی دنیا بھی نہیں چل سکتی اور آخرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی۔ وہ آپ کو معاشرے سے کاٹنا چاہتے ہیں، آپ اس معاشرے پر چھا جائیں۔ آپ ثابت کریں کہ ہم ایک زندہ جاوید پیغام کے داعی ہیں اور ہم جب حیاتِ جاوداں کی دعوت دیتے ہیں تو خود اپنے پاس ایک زندہ جاوید پروگرام بھی رکھتے ہیں۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب عوام سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لیے ہمیں اپنے اداروں میں فنی بنیادوں پر ''شعبۂ تعلقاتِ عامہ'' قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلقاتِ عامہ چونکہ ایک باقاعدہ فن ہے اس لیے اس نصاب میں یہ بھی رکھا گیا ہے۔ پوری امید ہے کہ اس کے بے حد اچھے نتائج دیکھے جا سکیں گے۔

ناپاک منصوبے......دوسری کوشش مغرب کی یہ ہے کہ مدارس کو جن راستوں سے، جن ذرائع سے وسائل حاصل ہوتے ہیں، اس کا انہوں نے بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، بڑی دقت نظر سے سروے کیا ہے کہ یہ مدارس اپنی ذاتی آمدنی نہیں رکھتے، ان کے مقابلے میں چلنے والے عصری ادارے کروڑوں کے بجٹ پر چلتے ہیں مگر اس طرح مثبت نتائج نہیں

دیتے جس طرح یہ بے سروسامان ادارے نتائج دیتے ہیں۔ان کے پاس اپنے بجٹ کو پورا کرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ، کوئی مستقل نظام نہیں ہے اور اس کے باوجود یہ چل رہے ہیں، فروغ بھی پا رہے ہیں، ترقی بھی کر رہے ہیں۔ نئے سے نئے مختلف النوع ادارے وجود میں بھی آرہے ہیں اور نتائج بھی دے رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے۔ واللہ! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ صفہ کے ساتھ بیٹھنے کا معجزہ ہے۔ مغرب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے چلتے ہیں؟ انہوں نے ان کا جائزہ لینے کے بعد ظاہری وسائل کو منجمد کرنے کے لیے بند کمروں میں وہ منصوبے بنائے ہیں جو دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

اصل ہدف......انہوں نے دیکھا کہ لوگ کس طرح ان دینی اداروں پر اعتماد کرتے ہیں اور کیسے اپنے اموال کو اپنی آخرت کا ذخیرہ بنانے کے لیے ان لوگوں پر خرچ کرتے ہیں اور کس طرح بغیر کسی منصوبہ بندی کے اتنے بھاری اخراجات پورے کر رہے ہیں؟ ان کی کوشش ہے کہ مدارس کے وسائل منجمد کیے جائیں۔ لہٰذا ہمیں مدارس کے لیے مستقل بنیادوں پر سوچنا پڑے گا۔ مدارس کے لیے وسائل کیسے حاصل کیے جائیں؟ مدارس کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں؟ اس وقت سے پہلے یہ سب کام ہمیں کرنا پڑے گا جب دشمن کوشش کرے گا کہ خدانخواستہ ان کے پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ وسائل حاصل کیسے کیے جاتے ہیں؟ ان کو منظّم کیسے کیا جاتا ہے؟ کم وسائل کو بہترین مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیسے خرچ کیا جاتا ہے؟ یہ ساری ''تنظیم'' ایک فن ہے جو اس کورس کا حصہ ہے۔

اوپر سے نظارہ......ہم دنیا کے علوم سے مرعوب نہیں لیکن ان میں سے اپنے مطلب اور کام کی چیزوں کی نفی کرنا یقیناً دانشمندی نہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ مدارس کی فضا ان چیزوں سے آلودہ ہو جائے جن چیزوں نے عصری اداروں کو آلودہ کر رکھا ہے اور جن چیزوں نے عصری اداروں میں استاد اور شاگرد کے مقدس تعلق کو ختم کر دیا ہے۔ درسگاہ کے تقدس کو پامال کر دیا ہے اور تعلیم اور تعلم کے اعلیٰ مقاصد کو انہوں نے روند ڈالا ہے۔ ان چیزوں کو ہم قطعاً مدارس میں نہیں لانا چاہتے۔ ہم مدارس کی روایات اور اساسی اقدار کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اسی پر جمے رہنا چاہتے ہیں، اسی پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسی پر مرنا چاہتے ہیں۔ ہم

کسی قیمت پر اپنا تعلق اپنے اکابر اور اپنے اسلاف سے نہیں کاٹ سکتے...... اپنے اس نظریے کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم ہر حال میں اس پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ہماری عاجزانہ دُعا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اسی پر فخر کرنے کی ہمت دے۔ مرتے دم تک علما کے ساتھ رکھے اور آخرت میں علمائے کرام کے ساتھ ہمارا حشر کرے۔ یہ ہمارا اصل نظریہ، عقیدہ اور ایمان ہے...... لیکن ملائیت خادم نہیں ہونی چاہیے، مخدوم ہونی چاہیے۔ یہ دنیا کو نیچے قدموں میں گر کر نہ دیکھے، یہ اوپر جا کر اس کا نظارہ کرے۔ یہ ہماری تمنا اور اصل ہدف ہے۔

زہریلا پروپیگنڈا...... تیسری بات وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اہلِ مدارس اس دنیا کے لوگ نہیں ہیں، یہ اس دنیا کا نظام نہیں چلا سکتے۔ یہ آسمان کے اوپر کی بات کر سکتے ہیں۔ زمین سے نیچے پر بھی گھنٹوں گھنٹوں بات کر سکتے ہیں، لیکن زمینی حقائق کا حل ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔ دنیا جن مسائل کا حل چاہتی ہے یہ ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ زمانے کی قیادت نہیں کر سکتے۔ یہ نظام نہیں چلا سکتے۔ لہٰذا آپ اس مصرفِ بے جا میں اپنی اولاد، عطیات اور مالی وافرادوسائل کیوں خرچ کرتے ہیں؟ آپ ان کو محبت وعقیدت کا مقام کیوں دیتے ہیں؟ ان کے سفید کپڑوں کا بھرم کیوں رکھتے ہیں؟ انہوں نے حسد اور بغض کی وجہ سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے چباڈالیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ فرسودہ روایات کے امین ہیں۔ دقیانوسی نظریات کے حامل ہیں۔ یہ اس دنیا ساتھ چلنے والے کے نہیں ہیں۔ اگر کبھی شب برات، جمعرات میں ان سے کوئی کام پڑ جائے تو ہاتھ چوم کر، نذرانہ دے کر ان سے عقیدت کا اظہار کرلو...... آگے کی اُمید کوئی ان سے نہ رکھے۔ ان میں کوئی تنظیم نہیں، ان میں اجتماعیت نہیں۔ ان میں اس دنیا کے چیلنجز کا سامنا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں۔ اہلِ مغرب اس بات کا پروپیگنڈا زبردست طریقے سے چلا رہے ہیں۔

بوریا نشین...... ایک اور بات سنیے! مغربی حکومتیں اگر مسلمان حکومتوں سے کام لیتیں تو چونکہ ہم بے سروسامان ہیں، بوریا نشین لوگ ہیں اس لیے یہ بھی بہت تھا...... لیکن انہوں نے مسلمان حکمرانوں کو بیچ سے ہٹا کر ہمیں براہِ راست ہدف بنایا۔ جب انہوں نے براہِ راست ہدف بنایا تو یہ بھی ان کے لیے بہت تھا۔ ہمارے پاس تھا کیا سوائے رات کو آنسوؤں کے دو قطرے بہانے

کے؟ دنیا کی کون سی طاقت ہماری پاس ہے؟ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ نہ ہوتا، اگر اصحاب صفہ سے ہماری نسبت نہ ہوتی، ہمارے اکابر کی دُعائیں نہ ہوتیں اور اللہ نے ان بوریا نشینوں سے ان تخت نشینوں کو شکست نہ دلوائی ہوتی تو ہمارے پاس تو اور کچھ نہ تھا۔

انقلابِ آفریں نظام.....لیکن انہوں نے مدارس پر براہِ راست حملے کے بعد آپس میں اتحاد بھی کرلیا۔ ہماری دشمنی نے ان کی باہمی دشمنیاں ختم کردی ہیں۔ ہم مسکینوں کے خلاف دنیا کی تمام طاقتیں ایک ہوچکی ہیں۔ پھر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا، چھوٹے چھوٹے شیطان بھی اپنے ساتھ ملائے۔ بہت سے ایسے صحافی ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ ٹوپی، عمامہ، سفید کرتہ ان چیزوں کے خلاف ذہن بنائیں۔ بہت سی این جی اوز کو ٹارگٹ دیا گیا ہے کہ کسی طرح سے مدرسے والوں کا کوئی عیب تلاش کرو، اس کی جو چاہو قیمت ہم سے وصول کرلو! لیکن ان لوگوں کو معاشرے میں دنیا والوں کے سامنے کسی طرح گرادو۔ یہ دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل حق کو بھی کتاب وسنت سے راہنمائی لینی چاہیے کہ ایسے وقت میں کیا کیا جاتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ دیکھنا چاہیے، اکابر کا طرزِ عمل دیکھنا چاہیے، اسلاف کی سوانح میں تلاش کرنا چاہیے کہ ایسے لمحات میں انہوں نے کیا کیا؟ ایسے وقت میں انہوں نے اپنا تعلق مع اللہ مضبوط کیا، توجہ الی اللہ میں رسوخ پیدا کیا اور توکل علی اللہ کرکے انہوں نے اپنی خامیوں کا جائزہ لیا اور اگر ان کے بارے میں کوئی بات درست کہی جارہی ہے تو فوراً اس کو ختم کردیا اور پھر اس کے بعد انہوں نے دنیا پر ثابت کردیا کہ تم جو کچھ کہہ رہے تھے، غلط تھا، جھوٹ تھا، پروپیگنڈا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی علیہ السلام جنہوں نے قلیل ترین وقت میں ایک انقلاب آفرین نظام دنیا کو دیا، ان کے ورثا اگر دنیا کا نظام نہیں چلا سکتے تو دنیا کا کوئی نظام پھر چل ہی نہیں سکتا۔

حقیقت سے موازنہ.....اس کورس میں اس بات کی بھی تربیت کی جائے گی کہ تنظیم کیسے کی جاتی ہے؟ افراد کار کا چناؤ اداروں کے لیے کیسے کیا جاتا ہے؟ کسی کی استعداد، رجحانات، میلانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو منتخب کرنا، پھر اس کے مزاج کے مطابق کام تفویض کرنا پھر اس کی نگرانی کرنا اور کم وقت میں کم وسائل خرچ کرکے کم افراد کو استعمال

کر کے دین کی سربلندی کا کام زیادہ سے زیادہ کرنا...... یہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ یہ اس کورس کا حصہ ہے۔

جب ہم نے سمجھا اس وقت ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے اور مستقبل میں ہمارے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے تو ہم نے غور و فکر کیا کہ اس کا حل کیا ہے؟ اس کا مقابلہ یوں ہو سکتا ہے کہ دنیا جس چیز کو معتبر سمجھتی ہے۔ اصل اعتبار ہماری چیز کا ہے لیکن اگر دنیا میں کسی ایسی چیز کو معتبر سمجھا جاتا ہے جو مباح ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسے اپنا لیں۔ مثلاً: کچھ لوگ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے مالیات کا نظام شفاف نہیں ہے۔ آپ دنیا کو بتائیں کہ آپ کے اعلیٰ ترین ساکھ رکھنے والے اداروں میں جو آڈٹ، جانچ پڑتال کا طریقہ کار ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر نظام ہمارے ہاں ہے۔ آپ کے ہاں لاکھوں روپے کی تنخواہیں لینے والے چار پانچ سال تک اپنے حسابات کو منظم کر کے نہیں دکھا سکتے اور ہم بوریا نشینوں کے پاس ایسے ''بوریا نشین'' موجود ہیں جو سال بہ سال تو کیا دن بدن کا حساب بھی آپ کو دکھا سکتے ہیں۔

وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں وسائل بے جا مصارف میں بے دھڑک خرچ ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کو بتایئے کہ ہمارے فلاحی منصوبے تو اس پورے معاشرے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سماج کا کون سا شعبہ ہے جہاں ہماری خدمات نہیں ہیں۔ جو بھی جس وقت بھی چاہے ہمارے دعوے کو حقیقت سے موازنہ کر کے سچ کو جھوٹ سے الگ کر سکتا ہے۔

علم اور فن میں فرق...... اس دنیا میں وہ فنون...... علوم نہیں فنون۔ علم تو صفتِ خاصہ اللہ تعالیٰ کی ہے اور ان دلوں میں اُتارتا ہے جس کو اس ذاتِ گرامی سے نسبت ہو جس پر روح الامین وحی لے کر آیا ہے۔ علم تو مقدس چیز ہے۔ اس مقدس چیز کا اطلاق ہم یہاں پر کر کے جہاں دنیا کی حقیر آسائشوں کے پیچھے رینگنے والے کیڑے جس کو سیکھتے سکھاتے ہیں اور پھر علم کا نام دیتے ہیں، ہم اسے علم نہیں کہہ سکتے۔ ان کے اس جراثیم زدہ اور آلودہ ماحول میں فنون ہی سکھائے جاتے ہیں۔

ان فنون کو سیکھنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم اپنے فضلا کو یہ فنون سیکھنے کے لیے عصری اداروں میں بھیجیں لیکن خطرہ یہ تھا کہ ہم ان کو وہاں اس لیے بھیجتے کہ ہمارے غموں کا مداوا

کریں۔ پتا چلا کہ وہ ''دردِ لا دوا'' وہاں سے لے کر آیا۔ وہاں کے جراثیم ساتھ لے آیا۔
دوسرا طریقہ یہ تھا آپ ماحول اپنا رکھیں جہاں اعمال کی پابندی ہو، ذکر و تلاوت کی مسحور کن صدائیں ہوں، صبح و شام کے مسنون اوراد ہوں اور جہاں تربیت بھی ہو...... جہاں پر نگرانی بھی ہو، جہاں خانقاہی ماحول بھی ہو۔ پھر آپ انہی فنون کے ماہرین کو لے کر علمائے کرام کی زیرِ نگرانی اس کے نصاب میں کانٹ چھانٹ، قطع و برید کر کے ان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر اپنے مزاج اور نظریے سے ہم آہنگ کر کے اسی ماحول میں وہ چیز سکھائیں جو ہیں کام کی لیکن انہیں سیکھنے کے لیے عصری تعلیمی اداروں میں جانے کے بعد بندہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس کورس کا مقصد یہ ہے۔

فیصلہ آپ پر ہے...... میرے اور آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم نیت کو دیکھیں، کام کو دیکھیں، کردار کو دیکھیں، مقاصد کو دیکھیں۔ اگر اکابر کے طرزِ عمل پر چل کر انہی کے مقصدِ زندگی کو، انہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھا جا رہا ہے اور جدید وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارے دعوت کے کام کو چار چاند لگ جائیں تو ہمیں بھی پھر اس مشن میں ہمسفر بن جانا چاہیے۔ آپ اپنے اساتذۂ کرام سے راہنمائی لیں، ان سے مشاورت کریں، ساتھ میں اس کی جانچ بھی کریں کہ مستقبل میں اگر مدارس کو، دینی اداروں کو ایسے افراد کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا والوں کو ان کی زبان میں جواب دے سکیں تو کیا ہم باہر سے ایسے لوگوں کو لائیں گے جو ہماری زبان نہیں سمجھتے، ہمارے مزاج کو نہیں سمجھتے، جو ہماری ترجمانی نہیں کر سکتے...... یا پھر ہم اپنے اندر سے ایسے لوگ پیدا کریں جو اس فرض کفایہ کو ادا کر سکیں جو اس فرض عین کے لیے مددومعاون ہے جس کی ادائیگی کا ذمہ اللہ نے ہم پر ڈالا ہے۔ کون سی بات بہتر ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں؟

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین!!!

مصنف کی دیگر کتب

تحقیقات و تالیفات	کالم اور مضامین	زیر طبع
شرح عقود رسم المفتی	بولتے نقشے	فہم الحدیث (تلخیص و تسہیل) معارف الحدیث
آداب فتویٰ نویسی	حرمین کی پکار	آپ ہدایہ کیسے پڑھیں؟
تسہیل السراجی	اقصیٰ کے آنسو	کتاب الجغرافیہ
الاملاء والترقیم	ہسپانیہ سے امریکا تک	جغرافیہ قرآنی
تحریر کیسے سیکھیں؟	عالمی یہودی تنظیمیں	چاند کے تعاقب میں
رہنمائے خطابت	عظمتوں کی کہانی	عالمی دجالی ریاست
اسلام اور تربیت اولاد (تلخیص و تسہیل)	امت مسلمہ کے نام	اسرائیل کی کہانی
خواتین کا دینی معلم	سرچنگ پوائنٹ	
دجال: کون، کب، کہاں؟	بسنت کیا ہے؟	
فارسی کا آسان قاعدہ	عالم اسلام پر امریکی یلغار کیوں؟ (ترجمہ و تعارف)	
گناہ معاف کرانے والی نیکیاں		

السعید
0313-9264214